اِس شمارے میں

نورِ ہدایت	راہِ خدا میں خرچ کرنے میں فائدہ ہی فائدہ ہے		۵
نظر وفکر	چند زریں نصیحتیں	محمد سلمان منصور پوری	۶
درسِ حدیث	ندامت ذریعۂ نجات ہے	مولانا اشہد رشیدی صاحب	۱۲
افاداتِ قرآنیہ	افادات سورۂ فتح	حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندویؒ	۱۵
مقالات ومضامین	عیدالفطر کے مسنون اَعمال	مولانا مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی	۲۲
	مسلمان اپنے اَسلاف کی.....	مولانا اسرارالحق قاسمی	۲۷
	حرمین شریفین کی خصوصیات واِمتیازات	مولانا مفتی محمد اجمل قاسمی	۳۱
	صدموں اور غموں بھرے لمحات	مولانا کلیم اللہ قاسمی	۳۸
	دنیا میں کیا کیا ہوگا؟	مولانا مفتی محمد عفان منصور پوری	۴۵
	انصارِ مدینہ میں سب سے پہلے.....	مولانا مفتی ابوجندل قاسمی	۴۹
	دینی تعلیم کی قدر کریں!	مولانا محمد حذیفہ ہردے پوری	۵۴
کتاب المسائل	کنایہ کے الفاظ سے طلاق کے مسائل	مفتی محمد سلمان منصور پوری	۶۰
منظومات	ہر زاویئے سے اُن کا ہے کردار بے مثال	مولانا عطاء الرحمٰن عطاؔء مفتاحی	۴۸
عالمی خبریں			ٹائٹل
جامعہ کے شب وروز	مہتمم جامعہ کے اسفار، واردین وصادرین، سالانہ امتحانات، سالانہ مجلس مشورہ، جامعہ کی مساجد میں تراویح واصلاحی بیانات، وفیات		۶۷

نورِ ہدایت:

راہِ خدا میں خرچ کرنے میں فائدہ ہی فائدہ ہے

ارشادِ ربانی: وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاةِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ. (البقرۃ: ۲۶۵)

ترجمہ: ''اور اُن لوگوں کی مثال جو اپنا مال اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اور اپنے دلوں کو (اِطاعت پر) ثابت قدم رکھ کر خرچ کرتے ہیں، ایسے باغ کے مانند ہے جو کسی ٹیلے پر واقع ہو، جس پر زور کی بارش برسے، پھر وہ (باغ) دوگنا پھل لائے، اور اگر اس پر زور کی بارش نہ ہو، تو پھوار ہی کافی ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتا ہے''۔

راہِ خدا میں مال خرچ کرنے کا مضمون پیچھے سے چل رہا ہے، اسی کو آگے بڑھاتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا کہ جو شخص حسن نیت کے ساتھ اور اپنے دل کو اِطاعت پر آمادہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کے لئے اپنا مال خرچ کرے گا، اُس کو کبھی نقصان نہیں ہوسکتا؛ بلکہ اُس کو دوسروں سے زیادہ نفع کا یقین رکھنا چاہئے۔

اِس آیت میں دلوں کو اِطاعت پر جمانے کی جو بات کہی گئی ہے وہ بہت اہمیت رکھتی ہے، گویا کہ نفس کو مال کی طرف طبعی میلان سے ہٹا کر اِطاعت پر جمانے سے ایسا ملکۂ راسخہ حاصل ہوگا جس سے دین کے لئے ہر قربانی دینا آسان ہوجائے گا، اور یہ بات تجربہ سے ثابت ہے کہ ایک جگہ قربانی کی عادت پڑنے سے دیگر مواقع پر بھی نفس کے خلاف کرنا آسان ہوجاتا ہے۔

پھر اس کی ایک بہترین مثال پیش کی؛ تاکہ بات بآسانی سمجھ میں آجائے کہ مثلاً ایک باغ کسی اونچے مقام پر واقع ہو، جہاں کی آب وہوا خوش گوار اور زمین بارآور ہو، تو اگر اس باغ پر موسلا دھار بارش ہوجائے تو وہ باغ بہترین اور مناسب مقام پر واقع ہونے کی وجہ سے نشیبی جگہ کے باغ کے مقابلہ میں دوگنا پھل دے گا، اور اگر تیز بارش نہ بھی ہو؛ بلکہ صرف بوندا باندی اور پھوار ہی سے تراوٹ ہوجائے تو اُس باغ کی بارآوری اور پیداوار میں اِضافہ کے لئے یہ بھی کافی ہے۔

اس مثال میں تیز بارش اور ہلکی پھوار کی مثال دراصل اخلاص کی کمی وبیشی کی محسوس تعبیر ہے، اور مقصود یہ ہے کہ اگر صدقہ کا عمل احسان جتانے اور ایذا رسانی سے محفوظ ہو تو پھر اخلاص کامل ہو یا معمولی ہو، بہرصورت صدقہ کا ثواب بڑھ کر ملے گا، اگرچہ اخلاص کے اعتبار سے درجات میں فرق ہو۔ (مستفاد: بیان القرآن مکمل ۱۵۹)

اس لئے ہر مسلمان کو چاہئے کہ حسن نیت کے ساتھ صدقہ خیرات کرنے کا معمول بنائے رکھے، اور اللہ تعالیٰ سے دنیا وآخرت میں بہترین بدلہ کا یقین رکھے۔ □□□

نظر وفکر

محمد سلمان منصور پوری
Mansoorpuri
@gmail.com

چند زریں نصیحتیں

امام المحدثین سیدنا حضرت عبداللہ بن المبارک رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۸۱ھ) نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف ''کتاب الزہد'' (ص: ۳۶۰) میں نقل فرمایا ہے کہ حضرت جابر بن سلیم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جھرمٹ میں تشریف فرما تھے، اور میں آپ کو پہچانتا نہ تھا، اس لئے میں نے مجلس میں پہنچ کر سوال کیا کہ: "اَیُّکُمُ النَّبِیُّ؟" یعنی آپ لوگوں میں پیغمبر (علیہ السلام) کون ہیں؟ تو یا تو خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف اِشارہ کیا یا کسی اور نے آپ کا تعارف کرایا، اب جو میں نے غور کیا تو دیکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک چھوٹی سی چادر باندھے ہوئے ہیں اور چادر کا پُھندنا آپ کے قدم مبارک پر پڑا ہوا ہے، (یعنی آپ عام ہیئت کے ساتھ نہایت سادگی سے تشریف فرما ہیں، کوئی تکلف یا امتیاز والی علامت آپ میں نہیں پائی جارہی ہے) بہرحال میں نے اپنی بات عرض کی کہ میں آپ کی خدمت میں نصیحت حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں، آپ مجھے نصیحت فرمایئے، تو میری درخواست سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی اہم نصیحتیں ارشاد فرمائیں:

(۱) تقویٰ اختیار کرو

پہلی نصیحت یہ فرمائی کہ ''اللہ سے ڈرا کرو'' [اِتَّقِ اللّٰہَ] یہ ایسی عظیم نصیحت ہے کہ اگر آدمی یہ صفت اپنے اندر پیدا کرلے تو وہ کامیاب ترین انسان بن سکتا ہے، اور دنیا وآخرت ہر جگہ اُسے عزت نصیب ہوسکتی ہے۔ یہی وہ صفت ہے جو انسان کو ہر طرح کی معصیت سے بچنے پر آمادہ کرتی ہے، اور ہر طرح کی اطاعت کا جذبہ بیدار کرتی ہے، اور متقی آدمی ہر وقت اِس فکر میں رہتا ہے کہ کہیں اس کا خالق ومالک اس سے ناراض نہ ہوجائے، اور اس سے کوئی معصیت صادر نہ ہوجائے، متقی شخص کو اِطاعت سے ایک خاص فرحت ملتی ہے، جب کہ معصیت کی وجہ سے وہ بے چین اور بے قرار ہوجاتا ہے، اور جب تک سچی توبہ نہ کرلے، اُسے چین وسکون نصیب نہیں ہوتا۔

(۲) کسی بھی نیکی کو کم تر نہ سمجھیں

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری نصیحت یہ فرمائی کہ: ''تم کسی بھی نیکی کو کبھی حقیر مت سمجھنا، خواہ وہ تمہاری طرف سے کسی کے لوٹے میں ڈول کا پانی ڈالنا ہی کیوں نہ ہو'' [وَلَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوْفِ شَيْئًا وَلَوْ أَنْ تَفْرُغَ مِنْ دَلْوِكَ فِيْ إِنَاءِ الْمُسْتَسْقِيْ] بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کسی نل سے اپنے لئے پانی بھر رہا ہے، اسی درمیان دوسرا شخص بھی پانی لینے کے لئے نل پر آجائے، تو پہلے سے پانی بھرنے والا شخص اگر اپنا بھرا ہوا لوٹا دوسرے شخص کے لوٹے میں ڈال دے تو اگر چہ یہ ایک معمولی عمل ہے؛ لیکن اس کو بھی آدمی کم تر نہ سمجھے؛ بلکہ اس پر اللہ تعالیٰ سے عظیم اجر وثواب کی امید رکھے۔

اِس نصیحت سے ہمیں یہ پیغام دیا گیا کہ بعض وہ کام جنہیں ہم معمولی سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں، موقع ملنے پر انہیں چھوڑنا نہیں چاہئے؛ بلکہ اُن پر عمل کر کے ثواب کی اُمید رکھنی چاہئے، مثلاً کسی بیمار کی مزاج پرسی کرنا یا کسی مسافر کو راستہ بتادینا، یا کسی نابینا شخص کو اس کی منزل تک پہنچادینا، یا کسی مسلمان کو کسی ذریعہ سے خوش کردینا وغیرہ، تو اِن جیسے اعمال کو اگر ہر شخص ثواب کی نیت سے انجام دینے لگے، تو پورے معاشرے میں بے مثال ہم دردی اور نصیحت کے جذبات فروغ پاجائیں اور تنازعات کا سرے سے خاتمہ ہوجائے۔

ایک صحیح حدیث میں وارد ہے کہ ایک شخص راستہ میں جارہا تھا، راستہ میں ایک کانٹے دار ٹہنی نظر پڑی، اُس نے اخلاص کے ساتھ اُسے راستہ سے ہٹادیا؛ تاکہ گذرنے والوں کو تکلیف نہ ہو، تو اللہ تعالیٰ نے اُس کے اِس عمل کو قبول فرمایا اور اُس کی مغفرت کا فیصلہ فرمادیا۔ (بخاری شریف رقم: ۲۴۷۲، مسلم شریف رقم: ۱۹۱۴، الترغیب والترہیب رقم: ۴۵۰۸)

(۳) اِتراہٹ سے بچیں!

تیسری ہدایت یہ فرمائی کہ: ''تم کبر وغرور اور اِتراہٹ سے بچتے رہنا؛ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو اِتراہٹ بالکل پسند نہیں ہے''۔ [إِيَّاكَ وَالْمِخْيَلَةَ؛ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمِخْيَلَةَ]

قرآنِ کریم میں حضرت لقمان رضی اللہ عنہ کے اپنے بیٹے کو نصیحتوں کے ضمن میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا، إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ﴾ [لقمان، جزء آیت: ۱۹] ''یعنی لوگوں کے سامنے گال مت پھلاؤ (متکبروں کی طرح بات مت

کرو؛ بلکہ خندہ پیشانی سے ملو) اور اَکڑ کر مت چلو، اللہ تعالیٰ کو شیخی بھگارنے والے اور فخر وغرور کرنے والے لوگ پسند نہیں ہیں''۔

اور اَحادیثِ شریفہ میں متکبر شخص کے لئے سخت ترین وعیدیں وارد ہیں، ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کے دل میں ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہو پائے گا: ''لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ اَحَدٌ فِي قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةِ خَرْدَلٍ مِّنْ كِبْرِيَاءٍ. (صحيح مسلم ١/٦٥، سنن الترمذي ٢/٢٠، مشكاة المصابيح ٢/٤٣٣)

اور ایک حدیث میں ہے کہ: ''تکبر کرنے والوں کو قیامت کے دن چیونٹیوں کی طرح آدمیوں کی صورت میں جمع کیا جائے گا۔ ذلت ان کو ہر طرف سے گھیرے ہوگی، ان کو جہنم کے قید خانہ کی طرف لے جایا جائے گا جس کا نام ''بولس'' ہوگا، ان پر ''آگوں کی آگ'' بلند ہوگی، اور انہیں دوزخیوں کے زخموں کا نچوڑ (خون پیپ وغیرہ) پلایا جائے گا جس کا نام ''طینۃ الخبال'' ہے''۔ (سنن الترمذی عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ، مشکوٰۃ شریف ۲/۴۳۳، الترغیب والترہیب رقم: ۴۴۱۹)

نیز پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ: ''جو اللہ کے لئے ایک درجہ انکساری کرے اللہ تعالیٰ اس کا مرتبہ بلند کرتا ہے تا آں کہ اسے علّیین میں اعلیٰ مقام تک پہنچا دیتا ہے، اور جو اللہ پر ایک درجہ تکبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا مرتبہ گھٹاتا ہے، حتی کہ اُسے جہنم کے سب سے نچلے درجہ تک پہنچا دیتا ہے''۔ (سنن ابن ماجہ ۳۰۸، الترغیب والترہیب رقم: ۴۳۹۵)

اور ایک حدیث میں یہ مضمون وارد ہے کہ: ''تمہارے سے پہلی اُمتوں کا ایک شخص تکبر کی بنا پر اپنا تہبند لٹکاتا تھا تو اسے زمین میں دھنسا دیا گیا اور وہ قیامت تک دھنستا ہی چلا جا رہا ہے''۔ (سنن النسائی ۲/۲۹۸ عن عبداللہ بن عمرؓ، الترغیب والترہیب رقم: ۴۴۲۴)

حاصل یہ ہے کہ تکبر اور خود پسندی ایسی بدترین خصلت ہے جو انسان کو دنیا، آخرت کہیں کا نہیں چھوڑتی، اور پھر اللہ کے مقابلہ میں تکبر کرنا تو نعوذ باللہ نہایت دیدہ دلیری کی بات ہے؛ اس لئے ہر مسلمان کو اس رذیلہ سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہئے، اور موقع بموقع اپنے عمل اور کردار کا جائزہ لیتے رہنا چاہئے۔

عجب وتکبر کے چور دروازے

چند ماہ قبل احقر کا گورکھ پور کا سفر ہوا، وہاں جناب حافظ کفایت اللہ صاحب زید کرمہم (جو کپڑے

کے مشہور تاجر اور بزرگوں کے صحبت یافتہ شخص ہیں) سے ملاقات ہوئی، اُنہوں نے دورانِ گفتگو ذکر کیا کہ شہر گورکھپور میں ایک بڑے بزرگ حضرت مولانا افتخار الحق صاحبؒ تھے، جو حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فیض یافتہ صاحب نسبت عالم دین تھے، موصوف ایک پرچہ چھاپ کر اکثر تقسیم کیا کرتے تھے، اس میں یہ نصیحت درج ہوتی تھی کہ: ہر آدمی کو عجب وتکبر کے درج ذیل سات چور دروازوں سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہئے:

(۱) جمال:- یعنی جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ ظاہری حسن وجمال سے نوازتے ہیں، وہ عموماً اپنے سے کم صورت والوں کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں، حالاں کہ یہ نہایت کم فہمی کی بات ہے؛ کیوں کہ حسن وجمال کوئی اختیاری چیز نہیں، یہ تو صرف اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اس میں انسان کی اپنی کوشش کا کوئی دخل نہیں، تو پھر اس پر کبر وعجب کا کیا سوال ہے؟ اس پر تو صرف شکر کا اظہار ہونا چاہئے۔

(۲) مال:- بعض لوگ اپنی مال داری پر ناز کرنے لگتے ہیں، اور غریبوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، حالاں کہ عزت ونجات کا مدار مال داری یا فقیری پر نہیں ہے؛ بلکہ ایمان اور اعمالِ صالحہ پر ہے؛ لہٰذا مال داری کی بنا پر کبر وغرور کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔

(۳) قوت:- اسی طرح اگر کسی شخص کو جسمانی قوت یا سیاسی طاقت حاصل ہوتی ہے تو وہ کمزوروں پر اپنی بڑائی ظاہر کرنے لگتا ہے، اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ حقارت کا معاملہ کرتا ہے، تو یہ بھی بڑی کم ظرفی کی بات ہے؛ کیوں کہ کوئی بھی دنیوی قوت وطاقت باقی رہنے والی چیز نہیں ہے۔

(۴) کثرتِ عبادت:- اور بسا اوقات کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبادات اور خدمتِ دین کی توفیق ملتی ہے، تو وہ اپنے کو دوسروں سے برتر سمجھنے لگتا ہے، اور جو لوگ دینی خدمات میں یا عبادات میں زیادہ مشغول نہیں ہیں، وہ ان کو کسی خاطر میں نہیں لاتا؛ بلکہ اُس کی ہر گفتگو میں انانیت ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ یہ بڑی خطرناک بات ہے، ان باتوں کی وجہ سے ساری عبادات کا اجر وثواب ضائع ہوجاتا ہے، اور ایسے متکبر شخص سے کسی خیر کی امید نہیں رکھی جاسکتی۔

(۵) علم:- کسی شخص کو علم کی دولت عطا ہو تو اُسے اس پر شکر بجالانا چاہئے، بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت عظیم انعام ہے؛ لیکن اگر اس علم کی وجہ سے آدمی دوسروں پر برتری جمانے لگے، اور ناوقف یا کم علم لوگوں کو حقیر سمجھنے لگے، اور ان کا مذاق اُڑانے لگے، تو ایسا علم، عالم کے لئے رحمت کے بجائے زحمت اور

وبال بن جاتا ہے۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ ایسا عالم مستحق جہنم ہے جو جاہلوں سے جھک بازی اور دوسروں پر برتری اور نام ونمود کے لئے علم سیکھے۔ (اللھم احفظنا منہ) (سنن ابن ماجہ رقم:۲۵۳، الترغیب والترہیب رقم:۱۸۰)

(۶) نسب:- کسی خاندان میں پیدا ہوجانا آدمی کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتا، اگر معزز خاندانوں سے وابستگی اختیاری ہوتی ہے تو کوئی شخص ان خاندانوں کے علاوہ کہیں اور پیدا ہونا قبول ہی نہ کرتا؛ لیکن یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ نے خالصۃً اپنے اختیار میں رکھا ہے کہ کس شخص کو کہاں پیدا کرنا ہے؟ پس اس بنیاد پر اپنے کو برتر اور دوسروں کو کم تر سمجھنا خود فریبی کے سوا کچھ نہیں ہے، اس کے بجائے آدمی کو اپنے عقائد واعمال درست رکھنے پر توجہ دینی چاہئے، اگر اپنے اعمال درست نہیں ہیں تو محض نسب سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے۔ اِرشادِ نبوی ہے: "مَنْ بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ". (صحیح مسلم ۳٤٥/۲) یعنی جس کا عمل اُسے پیچھے کردے تو اُس کا نسب اُسے آگے نہیں لے جاسکتا۔

(۷) ماننے والوں کی کثرت:- اگر کسی آدمی کے معتقدین کی کثرت ہوجائے تو عموماً اس کا دماغ آسمان پر پہنچ جاتا ہے، اور شیطان اُس کے دل میں بڑائی کا خناس بٹھا کر اس کی ساری محنتوں کو اَکارت کردیتا ہے۔

حضرت حسن بصریؒ سے مرسلاً روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: "آدمی اپنے اِردگرد لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر اپنے بارے میں دھوکہ میں ہرگز مبتلا نہ ہو"۔ [لَا يَغُرَّنَّ الرَّجُلَ مِنْ نَفْسِهِ كَثْرَةُ النَّاسِ حَوْلَهُ] (کتاب الزھد ۲۹۲) اس لئے ماننے والوں کی کثرت دیکھ کر کبھی فریب میں نہیں آنا چاہئے؛ بلکہ آدمی پر لازم ہے کہ ہر وقت اپنا محاسبہ کرتا رہے اور اپنا معاملہ اپنے رب سے درست رکھنے کی کوشش کرے۔

"میں کچھ بھی نہیں ہوں"

مذکورہ سات اَسبابِ عجب وکبر گنانے کے بعد اس اِصلاحی پرچہ میں عارف باللہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی رحمۃ اللہ علیہ کے یہ اَشعار درج تھے:

یہ دل کی ہے آواز، کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں ❖ اس پر ہے مجھے ناز، کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں
کچھ ہونا مرا، ذلت وخواری کا سبب ہے ❖ یہ ہے میرا اعزاز، کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں
تیرے کرمِ خاص پہ سو جان سے قربان ❖ میں اس سے ہوا ممتاز، کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں

اِن عارفانہ اشعار میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ انسان کا کمال اس کی فنائیت میں ہے، جو شخص جس قدر فنائیت میں آگے بڑھے گا، اُسی قدر اُس کی قدر ومنزلت میں اِضافہ ہوگا۔ یہی بات اِس حدیث نبوی میں ارشاد فرمائی گئی ہے کہ: مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ (مشکاۃ المصابیح ۴۳۴/۲) (یعنی جو اللہ کے لئے اپنے کو کمتر سمجھتا ہے اللہ تعالیٰ اسے سربلندی سے نوازتے ہیں)

(۴) کسی کی عیب جوئی نہ کریں

مذکورہ حدیث میں چوتھی ہدایت یہ کی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص تمہاری عیب جوئی کرے تو اس کے جواب میں تم اُس کے عیب کا افشاء نہ کرو، اگر تم یہ عمل کروگے تو تمہیں اس کا اجر ملے گا، اور دوسرے شخص پر گناہ ہوگا۔ (وَإِنْ امْرُؤٌ شَتَمَكَ فَعَيَّرَكَ بِأَمْرٍ يَعْلَمُهُ فِيْكَ فَلَا تُعَيِّرْهُ بِأَمْرٍ تَعْلَمُهُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ لَكَ أَجْرُهُ وَعَلَيْهِ إِثْمُهُ)

یہ ہدایت نہایت عظیم الشان ہے، اور اعلیٰ ترین ایمانی صفت کا مظہر ہے؛ اس لئے کہ اِنسان عموماً عیب جوئی کے جواب میں دوسرے کی عیب جوئی اور آگے بڑھ کر کرتا ہے، جس کی وجہ سے اختلافات اور بدگمانیاں بڑھتی ہیں، اور معاشرہ میں فساد پھیل جاتا ہے، اس کے برخلاف اگر آدمی ایسے موقع پر کچھ صبر سے کام لے اور برائی کا جواب برائی سے نہ دے اور غصہ کو پی جائے تو بڑے سے بڑے فتنہ پر پانی پڑ جاتا ہے، اور بات وہیں کی وہیں ختم ہوجاتی ہے، بار بار تجربہ سے یہ بات کارگر ثابت ہوئی ہے۔

(۵) گالم گلوچ نہ کریں

اور آخری بات پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ ارشاد فرمائی کہ: ''تم کسی کو ہرگز گالی مت دینا'' [وَلَا تَسُبَّنَّ أَحَدًا] (کتاب الزھد ۳۶۰) معاشرہ میں انتشار پھیلانے میں گالی گفتار کا بڑا دخل ہوتا ہے، گالی دینے سے سامنے والے کے دِل میں ایسا اشتعال رونما ہوتا ہے کہ وہ جواب میں سب کچھ کر گذرنے پر تیار ہوجاتا ہے؛ کیوں کہ یہ گالی آدمی کی عزت نفس پر براہِ راست اثر انداز ہوتی ہے، جس کا تحمل کرنا ہر ایک کے بس میں نہیں ہوتا، اس لئے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس فساد کی جڑ کو سرے سے ختم کرنے کے لئے ہدایت فرمائی کہ کوئی شخص کسی کو گالی ہرگز نہ دے؛ تاکہ معاشرہ میں سکون ووقار کا ماحول قائم رہے، اور فتنہ وفساد سے حفاظت رہے۔ اللہ تعالیٰ پوری اُمت کو مذکورہ بالا ہدایات پر مکمل عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔ □□□

درسِ حدیث:

ندامت ذریعۂ نجات ہے

حضرت مولانا اشہد رشیدی صاحب مہتمم جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ –رَضِيَ اللهُ عَنْهُ– قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ رَجُلَيْنِ كَانَا فِيْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ مُتَحَابَّيْنِ، أَحَدُهُمَا مُجْتَهِدٌ فِيْ الْعِبَادَةِ، وَالْآخَرُ يَقُوْلُ مُذْنِبٌ، فَجَعَلَ يَقُوْلُ: أَقْصِرْ عَمَّا أَنْتَ فِيْهِ، فَيَقُوْلُ: خَلِّنِيْ وَرَبِّيْ حَتّٰى وَجَدَهُ يَوْمًا عَلٰى ذَنْبٍ اسْتَعْظَمَهُ، فَقَالَ: أَقْصِرْ، فَقَالَ: خَلِّنِيْ وَرَبِّيْ أَبُعِثْتَ عَلَيَّ رَقِيْبًا؟ فَقَالَ: وَاللهِ لَا يَغْفِرُ اللهُ لَكَ أَبَدًا، وَلَا يُدْخِلُكَ الْجَنَّةَ، فَبَعَثَ اللهُ إِلَيْهِمَا مَلَكًا، فَقَبَضَ أَرْوَاحَهُمَا، فَاجْتَمَعَا عِنْدَهُ، فَقَالَ لِلْمُذْنِبِ: أُدْخِلِ الْجَنَّةَ بِرَحْمَتِيْ، وَقَالَ لِلْآخَرِ: أَتَسْتَطِيْعُ أَنْ تَحْظُرَ عَلٰى عَبْدِيْ رَحْمَتِيْ، فَقَالَ: لَا! يَا رَبِّ، قَالَ: إِذْهَبُوْا بِهِ إِلَى النَّارِ. (رواه أحمد، مشكوة: ۲۰۵)

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ: بنی اسرائیل میں دو آدمی تھے، جو آپس میں ایک دوسرے سے محبت کیا کرتے تھے، ان میں سے ایک عبادت میں بڑی محنت کیا کرتا تھا، جب کہ دوسرا اپنے آپ کو گنہگار کہا کرتا تھا، پہلا ساتھی اس سے کہا کرتا تھا کہ تو ان گناہوں کو چھوڑ دے، کہ جن میں تو مبتلا ہے، دوسرا کہتا کہ تو مجھ کو اور میرے خدا کو چھوڑ دے، حتی کہ ایک دن پہلے ساتھی نے دوسرے کو ایسے گناہ میں مبتلا پایا کہ جس کو وہ بہت بڑا سمجھتا تھا، چنانچہ اس نے پھر کہا کہ گناہوں سے باز آجا، اس نے وہی جواب دیا کہ تو مجھ کو اور میرے رب کو چھوڑ دے، کیا تجھ کو میرے اوپر نگراں بنا کر بھیجا گیا ہے؟ پہلے والے نے کہا: خدا کی قسم اللہ تیری مغفرت کبھی نہیں کرے گا، اور تجھ کو اپنی جنت میں کبھی داخل نہیں کرے گا، اللہ رب العزت نے دونوں کی طرف ملک الموت کو بھیجا، جنہوں نے دونوں کی روحوں کو قبض کرکے اللہ رب العزت کے سامنے پیش کردیا، اللہ رب العزت نے گنہگار سے کہا: جنت میں میری رحمت کی وجہ سے داخل ہوجا۔ اور دوسرے سے فرمایا کہ کیا تو اس بات کی طاقت رکھتا ہے کہ میرے بندے کو میری رحمت سے دور کردے؟ اس نے کہا کہ اے رب میں اس کا اختیار نہیں رکھتا ہوں، اللہ رب العزت نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ اس کو جہنم میں جھونک دو۔

تشریح: نبی کریم علیہ السلام اپنی امت کو جہاں اعمالِ صالحہ کو اختیار کرنے کا حکم دیا کرتے تھے، وہیں ظاہر وباطن میں یکسانیت کو اختیار کرنے اور دوغلے پن سے بچنے کی بھی تلقین کرتے تھے، اسی طرح آپ امت کو اپنی کوتاہیوں پر نظر رکھنے اور زندگی بھر توبہ واستغفار کرتے رہنے کی بھی تاکید کیا کرتے تھے۔ زیر نظر حدیث شریف بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنو اسرائیل کے دو دوستوں کا واقعہ نقل کرکے ہم میں سے ہر ایک کو اپنی فکر کرنے اور دوسروں کے بجائے اپنے گناہوں پر نظر رکھنے کا درس دے رہے ہیں:

واقعہ کی تفصیل حسبِ ذیل ہے

مذکورہ روایت میں آپ نے بنو اسرائیل کے دو ساتھیوں کا واقعہ نقل کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ دو آدمی تھے، وہ آپس میں ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے تھے، ان میں سے ایک عابد وزاہد تھا، جب کہ دوسرا لاابالی تھا، اور اپنے آپ کو گنہگار کہا کرتا تھا۔ پہلے ساتھی نے اس کو نصیحت کرنی شروع کی اور اس کو گناہوں سے باز رہنے کی تلقین کی، تو اس نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ تم مجھ کو چھوڑ دو میں جانوں اور میرا خدا جانے۔ ایک دن نیک ساتھی نے دوسرے کو کسی بڑے گناہ میں مبتلا دیکھ لیا، اور اس کو نصیحت کرنی چاہی تو اس نے کہا کہ تم مجھ کو چھوڑ دو، تم کو خدا نے میرے اوپر نگراں بنا کر کے تو بھیجا نہیں ہے، پھر تم کیوں مجھ کو نصیحت کرتے رہتے ہو؟ اس پر اس کے ساتھی نے غصہ میں آکر یہ کہہ دیا کہ: ''خدا کی قسم اللہ تیری کبھی مغفرت نہیں کرے گا اور تجھ کو ہرگز اپنی جنت میں داخل نہیں کرے گا'' (کچھ دن کے بعد) اللہ رب العزت نے دونوں ساتھیوں کے پاس ملک الموت کو بھیجا، تاکہ دونوں کی ایک ساتھ روح قبض کرکے دربار خداوندی میں پیش کریں۔ چنانچہ جب دونوں کو پیش کیا گیا تو اللہ نے گنہگار بندے سے فرمایا کہ جا میں اپنے فضل وکرم سے تجھ کو جنت میں داخل کرتا ہوں۔ اور دوسرے سے فرمایا کہ تو کون ہوتا ہے میرے بندے کو میری رحمت سے محروم کرنے والا؟ اور پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کو جہنم رسید کردو۔

ضروری باتیں

مندرجہ بالا واقعہ سے دو اہم باتیں ظاہر ہوتی ہیں، جن کی طرف اشارہ کرکے نبی کریم علیہ السلام اپنی امت کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں:

(۱) مذکورہ واقعہ سے پہلی بات تو یہ واضح ہوتی ہے کہ گنہگار کو کبھی بھی خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہئے؛ بلکہ ندامت کا اظہار کرکے توبہ واستغفار میں لگے رہنا چاہئے، اگر توبہ کے بعد پھر گناہ ہوجائے

تو پھر توبہ کرلے اور سچے دل سے اس عزم کا اظہار کرے کہ اے رب ذوالجلال! آئندہ جان بوجھ کر گناہ نہیں کروں گا؛ لیکن اگر پھر گناہ ہوجائے تو مایوس ہونے کے بجائے پھر توبہ کرے؛ کیوں کہ یقیناً انسان گناہ کرتے کرتے تھک جائے گا، مگر خدائے رحیم وکریم معاف کرتے کرتے نہیں تھکے گا، مگر یہ اہم شرط ہر ایک کو اپنے ذہن میں رکھنی چاہئے کہ معافی اسی کی ہوگی جو بار بار توبہ کرتا رہے گا، خدا کے سامنے اپنے گناہوں کو یاد کرکے روتا دھوتا رہے گا۔ اور اپنے جرائم کا اقرار کرکے دل کی گہرائیوں سے استغفار کرتا رہے گا، اس کے برخلاف جو شخص گناہوں کی دلدل میں دھنستا چلا جائے اور خدا کی طرف متوجہ ہوکر گناہوں پر ندامت کا اظہار کرنے کی توفیق اس کو میسر نہ آئے، نہ وہ توبہ کرے اور نہ خدائے ذوالجلال سے معافی کا طالب بنے، تو بظاہر اس کی نجات کی راہیں بند ہوجائیں گی، اور وہ خدا کے غضب کا شکار ہوگا۔

(۲) مذکورہ واقعہ سے دوسری بات یہ واضح ہوتی ہے کہ انسان کو کبھی بھی اپنی نیکیوں پر اترانا نہیں چاہئے، اپنی لغزشوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے اور کبھی بھی گنہگاروں کو اپنے سے کمتر نہیں سمجھنا چاہئے، عام طور پر دیندار اور پرہیزگار لوگ میں عجب وتکبر کا عیب پایا جاتا ہے، دوسرے لوگوں کو وہ بے حیثیت سمجھنے لگتے ہیں، خاص طور پر اگر کسی کو دینی کاموں کو انجام دینے کا موقع مل جائے۔ اور خدا کی طرف سے اس کو دین کے لئے کچھ وقت لگانے کی توفیق میسر آجائے تو وہ اپنے آپ کو آسمانی مخلوق سمجھنے لگتا ہے، ہر ایک پر تنقید کرنا اور ہر ایک میں کمیاں نکالنا وہ اپنی ذمہ داری سمجھنے لگتا ہے۔ اور دینی علوم سے نابلد ہونے کے باوجود بے سند باتیں بیان کرکے عام لوگوں کے دلوں میں دین سے واقف ہونے کا رعب ڈالنا چاہتا ہے، ایسے لوگوں کو اپنے انجام کی فکر کرنی چاہئے، محض اپنے چند ٹوٹے پھوٹے اعمال کی وجہ سے غرور وتکبر میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے اور ہرگز کسی کو اپنے سے کمتر نہیں سمجھنا چاہئے۔ اور اسی طرح کسی کو گناہوں میں مبتلا دیکھ کر اس کے جہنمی ہونے کا فیصلہ نہیں کرنا چاہئے، کیوں کہ رب ذوالجلال ہی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس کو چاہے اپنی رحمت کا مستحق بنادے اور جس کو چاہے اپنی رحمت سے محروم کردے، ہمیں اس کے فیصلے کا کوئی حق نہیں ہے، ہم صرف برائیوں پر روک ٹوک کریں، اچھائیوں کو پھیلائیں، اس کے علاوہ آخرت کے امور میں ہمیں لب کشائی کا کوئی اختیار نہیں ہے، اس کا مالک تو رب ذوالجلال ہی ہے، وہی جس کے لئے جو مناسب سمجھے گا فیصلہ فرمائے گا۔

اللہ رب العزت ہمیں اپنے گناہوں پر نظر کرنے اور پھر توبہ واستغفار کرکے، ان کو معاف کرانے کی توفیق نصیب فرمائے۔ (آمین) وصلی اللہ علی النبی الکریم۔

❍❖❍

اِفاداتِ قرآنیہ:

اِفادات: سورۂ فتح

افادات: عارف باللہ حضرت اقدس مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی نوراللہ مرقدہٗ

ضبط وترتیب: حضرت مولانا مفتی محمد زید صاحب مظاہری ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

غم ومصیبت اور گھٹن کا علاج اور ایمانی ترقی کا آسان نسخہ

سورۂ فتح کا شانِ نزول اور پورا واقعہ ماقبل میں گذر چکا ہے، صحابہ کرام پر یہ بہت شاق گذر رہا تھا، اور اُن کو طبعی ناگواری بھی تھی، اس بات سے کہ اتنے دب کر صلح کیوں ہورہی ہے، اور یہ بڑی مصیبت اور دلی تنگی کا موقع تھا، صحابہ کرام اندر ہی اندر گھٹ رہے تھے؛ لیکن ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ نے ان پر سکینہ نازل فرمایا، اس وقت صحابہ کرام نے اپنی طبیعت پر عقل وشریعت کو غالب کیا، اور یہ سوچا کہ جب ہم سے بڑے، ہمارے نبی ہمارے سرکار اس پر تیار ہیں، اور وہ یہ کام کررہے ہیں، تو ہم کیا چیز ہیں؟ اسی میں خیر ہوگی، ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر ایمان کے محافظ نہیں ہوسکتے، اس طرح اللہ تعالیٰ نے اُن پر سکینہ نازل فرمایا، جس سے ان کے قلب کو سکون واطمینان ہوا، طبعی کڑھن اور گھٹن اپنی جگہ پر تھی؛ لیکن عقلی طور پر اپنے کو اس طرح سمجھایا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی پر اگر کبھی کوئی مصیبت وپریشانی آئے، ناگوار حالات سے سابقہ پڑے، ایسے وقت میں طبعی ناگواری، رنج وغم اور پریشانی تو ہوتی ہی ہے؛ لیکن عقلی طور پر اپنے کو سمجھانا چاہئے کہ یہ حالات اللہ کی طرف سے آئے ہیں، اس میں کوئی مصلحت ہوگی، نتیجہ انشاء اللہ اچھا ہوگا، اللہ تعالیٰ کے انعامات کو سوچ سوچ کر راضی رہنا چاہئے، اطمینان حاصل کرنے کا طریقہ ہی یہ ہے کہ عقل وشریعت کے مقابلہ میں طبیعت کو پس پشت ڈال دے اور عقل وشریعت کے مقتضی اور اُس کے فیصلہ پر عمل کرے، اسی سے قلبی سکون بھی حاصل ہوتا ہے، ایمان میں زیادتی اور روحانی ترقی بھی ہوتی ہے، چناں چہ حق تعالیٰ نے آگے فرمایا: ﴿لِيَزْدَادُوْا اِيْمَانًا﴾ یعنی ایسا اس واسطے کیا گیا اور ناگوار حالات اس لئے ڈالے گئے؛ تاکہ اس سے ایمان میں ترقی اور زیادتی ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ طبعی ناگواری کے باوجود شریعت کے مقتضی پر عمل کرنے سے ایمان میں ترقی ہوتی ہے، خواہ دل چاہے یا نہ چاہے، اسی کا نام مجاہدہ ہے، اعمال کی خاصیت ہے کہ اس سے ہر حال میں ترقی ہوتی ہے، خواہ ان اعمال کے کرنے کا جی چاہے یا نہ چاہے، جیسے کھانے کی خاصیت ہے اُس سے پیٹ بھرتا ہے، پانی کی خاصیت ہے اس سے پیاس بجھتی ہے، لباس کی خاصیت ہے اُس سے سردی دور ہوتی ہے، ایسے ہی اعمال کی خاصیت ہے کہ اس سے ترقی ہوتی ہے، اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے، خواہ اس عمل کے کرنے میں طبعی ناگواری ہی کیوں نہ ہو، طبعی ناگواری کے ساتھ کڑوی دوا پی جاتی ہے، گولی کھائی جاتی ہے، تو اس کا اثر ہوتا ہے، اسی طرح جب اعمال کئے جائیں گے تو ان کا اثر کیوں نہ ہوگا؟ اور اُس سے ترقی کیوں نہ ہوگی؟

ہدایت کے مختلف درجات

وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُسْتَقِيْمًا: (اور آپ کو سیدھی راہ پر لے چلے)

حق تعالیٰ شانہ نے صلح حدیبیہ کو ''فتح مبین'' قرار دے کر مختلف نعمتوں اور انعام کا وعدہ فرمایا، اور صراطِ مستقیم پر رہنمائی کا بھی ذکر فرمایا، ہدایت اور صراط مستقیم پر تو سارے صحابہ تھے ہی؛ لیکن ہدایت کے مختلف درجات ہوتے ہیں، ایک درجہ ہدایت کا ایمان کا ہے، اس کے بعد ہدایت کے مختلف درجات ہیں، ایمان تو ایک پونجی ہے، آگے اس کی بہت سی شاخیں ہیں، یہاں پر صراطِ مستقیم پر ہدایت دینے سے اس کے درجات ہی مراد ہیں کہ اس صلح حدیبیہ کی وجہ سے تمہارے ایمان میں ترقی ہوگی، درجات بلند ہوں گے، اور وہ ترقی کیسے ہوگی؟ مجاہدہ کی زندگی کے بعد؛ کیوں کہ اپنی مرضی اور خواہش کو شریعت کے حکم کے آگے بالکل فنا کر دینا یہی مجاہدہ ہے۔

ترقی مجاہدہ کے بعد ہی ہوتی ہے

اس سے معلوم ہوا کہ ترقی مجاہدہ کے بعد ہی ہوتی ہے، اور مجاہدہ سے مراد یہ ہے کہ شریعت کے حکم کے آگے اپنی خواہشات کو پامال کر دے، اگر کسی آدمی کو یہ بات حاصل ہو جائے تو بڑی نعمت ہے، ایسے شخص کو باطنی طور پر اتنی خوشی حاصل ہوتی ہے اور قلب میں اتنا سکون حاصل ہوتا ہے کہ ساری دنیا اُس کے

سامنے ہیچ ہے، اسی کا نام سکینہ ہے، سکینہ اللہ کا بڑا انعام ہے؛ لیکن یہ حاصل ہوتا ہے بڑے مجاہدوں کے بعد، اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ نعمت نصیب فرمائے۔

حق تعالیٰ کی بڑی نعمت

یہ بہت بڑی بات ہے کہ آدمی اپنے جذبات اپنی خواہشات پر عمل نہ کرے؛ بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی منشاء کو پورا کرے، اور اُسی کے حکم کے مطابق عمل کرے، اس میں بڑا مجاہدہ کرنا پڑتا ہے، آدمی کی اپنی تجویز اور خواہش کچھ بھی ہو؛ لیکن اللہ کے رسول کی منشاء اور شریعت کے آگے سب کو قربان کردے، یہ بڑی بات ہے؛ لیکن یہ آسان نہیں، اس میں نفس پر آرا چلانا پڑتا ہے، بڑا مجاہدہ کرنا پڑتا ہے، اللہ پاک کسی کو یہ نعمت نصیب کردے، بڑی نعمت ہے اور یہ بات حاصل ہوتی ہے بزرگوں کی صحبت سے، اور جس کو یہ نعمت نصیب ہوجائے، اس کے قلب کو سکون وطمانینت کی دولت نصیب ہوجاتی ہے، اسی کا نام سکینہ ہے، جس کو قرآن نے کہا ہے: ﴿وَاَنْزَلَ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةَ﴾

اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے جس سے وہ کوئی دینی کام لے لے

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: (آسمان وزمین کا سارا لشکر اللہ ہی کا ہے)

اس آیت کا ماقبل ومابعد سے ربط یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر صحابہ کرام کو اس کی توفیق نصیب فرمائی اور ان سے یہ کام لیا کہ صحابہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اولاً بیعت جہاد کی، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی بنا پر صلح پر بھی تیار ہوگئے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے فرمارہا ہے کہ ہم بندوں کے محتاج نہیں، اس کے قبضہ میں تو آسمان وزمین کا پورا لشکر ہے، وہ جب اور جس سے چاہے کام لے لے، اس کا احسان ہے کہ اس نے تم سے کام لیا، اور تم کو اس کام کے لئے قبول فرمایا، ورنہ اللہ تعالیٰ کو تمہاری کیا ضرورت؟ وہ تو جس سے چاہے کام لے لے، وہ چاہے تو بادل اور ٹڈی سے، چڑیا سے، پہاڑوں سے کام لے لے، اس نے تم سے کام لیا اور تم کو توفیق بخشی، اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے، اللہ کا تم پر بڑا احسان ہے کہ اس نے تم سے یہ کام لیا، اس کی نعمت کی اور توفیق کی قدر کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔

انفرادی اعمال کی اہمیت اور تبلیغی کام کرنے والوں کے لئے اہم نصیحت

تَـرَاهُـمْ رُكَّـعًا سُجَّدًا يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا: (اے مخاطب تو ان کو دیکھے گا کہ کبھی رکوع کررہے ہیں، کبھی سجدہ کررہے ہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں لگے ہیں)

اس آیت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا وصف بیان کیا ہے کہ وہ ایمان میں بھی کامل تھے اور اعمال میں بھی کامل تھے صرف یہی نہیں کہ ایمان مضبوط ہو، آپس میں رحم دل ہوں، ایک کام کو لے لیا اور باقی سے توجہ ہٹالی، وہ جیسے ایمان میں کامل تھے، اور اس کی محنت کرتے تھے، ایسے ہی دیگر اعمال میں بھی محنت کرتے تھے۔

اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ آدمی صرف اجتماعی کاموں ہی میں نہ لگا رہے؛ بلکہ اجتماعی کاموں کے ساتھ انفرادی کام بھی کرے، خود اپنی بھی فکر کرے، اپنے نفس کی اصلاح سے غافل نہ ہو، ہر وقت تبلیغ ہی تبلیغ میں دوسروں ہی کی فکر میں نہ پڑا رہے؛ بلکہ کوئی وقت ایسا بھی نکالے جس میں تنہائی میں اپنے نفس کا محاسبہ کرے، ذکر وشغل کرے، نماز پڑھے، اور اپنے گھر والوں بیوی بچوں کی بھی فکر کرے، جن کے متعلق قیامت میں اس سے سوال ہوگا۔

یہاں پر رکوع وسجود کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہونے میں نماز پڑھنے اور رکوع وسجدہ کرنے کو بہت دخل ہے، نماز کے ذریعہ حق تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے، اس لئے فرائض کے علاوہ نوافل کا بھی اہتمام کرنا چاہئے۔

آدمی کو اپنی زندگی میں کوئی ایسا کام کرنا چاہئے جس سے اللہ راضی اور خوش ہوجائے

بعض کام ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اس میں رضا وخوشی زیادہ ہوتی ہے، وہ کام اللہ تعالیٰ کو اتنا پسند ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سارے گناہ معاف کردیتا ہے، وقت کی اہمیت ونزاکت اور حالات کے اعتبار سے ایسے کام کے مواقع آتے رہتے ہیں، ایسے موقعوں سے آدمی کو فائدہ اٹھانا چاہئے، آدمی کو چاہئے کہ اپنی زندگی میں کوئی ایسا کام کرجائے جو اللہ کو راضی اور خوش کردے، جذبہ ایسا ہی ہونا چاہئے، اللہ

تعالیٰ نیت اور جذبہ کو دیکھتا ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جہاد پر بیعت کی تھی، جس کو بیعت رضوان کہتے ہیں، صحابہ کرام میں جان و مال کی قربانی کا جذبہ تھا، اسی پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تھی، محض اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے مغفرت کا وعدہ اور اعلان فرمادیا: ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ حالاں کہ لڑائی وغیرہ کچھ نہ کرنی پڑی اللہ تعالیٰ تو دلوں کو دیکھتا ہے۔

تواضع اختیار کرنے والے کو اللہ تعالیٰ عزت و سربلندی نصیب کرتا ہے

جو اللہ واسطے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ کے حکم کے آگے چھوٹا بننا گوارہ کرلیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو عزت اور بلندی نصیب فرماتا ہے، صلح حدیبیہ کے موقع پر کفار مکہ نے صلح نامہ میں ''محمد رسول اللہ'' لکھنے سے انکار کیا اور ''محمد بن عبداللہ'' لکھنے پر اصرار کیا، اللہ کا حکم بھی یہی تھا، چناں چہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''محمد بن عبداللہ'' لکھ کر صلح کرنے کو گوارہ کرلیا، اللہ کے حکم کی وجہ سے حق کی خاطر چھوٹا بننا گوارہ کرلیا، پوری صلح حدیبیہ بظاہر کتنے دب کر ہوئی؛ لیکن اللہ کا حکم یہی تھا، اللہ کے حکم کے آگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے چھوٹا بننا اور دب کر صلح کرلینا گوارہ کرلیا، پھر دیکھو اللہ نے اسی صلح کی بدولت صحابہ کرام کو کیسی عزت اور کتنی سربلندی نصیب فرمائی، اور اسلام کو کتنی ترقی ہوئی، فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس شان سے مکہ میں داخل ہوئے، یہ اسی صلح کا نتیجہ تھا، جس میں بظاہر بہت دب کر صلح کرنی پڑی تھی، اللہ کے حکم کے آگے جو چھوٹا بن جائے، تواضع اختیار کرلے، اللہ تعالیٰ اس کو عزت اور سربلندی نصیب فرماتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ'' (جو اللہ واسطے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو عزت اور سربلندی نصیب فرماتا ہے، اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل سے ہم سب کو تواضع اختیار کرنے کی توفیق نصیب فرمائیں، آمین۔

اہل اللہ کی فراست کی ایک حکایت

سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ: (ان کے آثار بوجہ تاثیر سجدہ کے اُن کے چہروں پر نمایاں ہیں)

عبادت کا ایک نور ہوتا ہے، جس کو نور والے ہی پہچانتے ہیں، ہر ایک نہیں پہچان سکتا، بعض اللہ کے

بندے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ صورت دیکھ کر عبادت کا نور یا معصیت کی ظلمت کو پہچان لیتے ہیں، عبادت اور تقویٰ کی برکت سے اُن کو یہ دولت نصیب ہوتی ہے۔

سہارن پور کے علاقہ میں ایک گاؤں چاند پور ہے، وہاں ایک بزرگ رہتے تھے، جن کا نام چاند شاہ تھا، نام تو کچھ اور ہوگا؛ لیکن چاند شاہ سے مشہور ہوگئے تھے، اُن کے اندر اللہ نے یہ خوبی رکھی تھی کہ وہ چہرہ دیکھ کر پہچان لیا کرتے تھے، اس نے کون سی حرکت کی، اور کن گناہوں میں یہ مبتلا ہے، بطور فراست یا کشف کے اُن کو یہ بات چہرہ دیکھ کر معلوم ہوجاتی تھی، صبح اور شام کو اُن کی مجلس لگتی تھی، بڑے بڑے علماء اُن کی مجلس میں آتے تھے، اور مجلس میں آتے ہوئے تھرّاتے اور ڈرتے بھی تھے، وہ بزرگ چہرہ دیکھ کر جس کے متعلق جو برائی محسوس فرماتے، اُس کی غلطی کو تو ظاہر نہ کرتے؛ تاکہ سب کے سامنے اُس کی شرمندگی نہ ہو؛ لیکن ایسے انداز سے اُس کو نصیحت کرتے کہ وہ سمجھ جاتا، وہ ہر ایک سے یہی کہتے کہ میرے چاند میرے پیارے ایسا نہیں کرتے، وہ ہر ایک کو میرے چاند ہی کہتے تھے، اس لئے اس کا لقب ہی ''چاندہ شاہ'' ہوگیا۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے متعلق بھی منقول ہے کہ وہ وضو کا پانی دیکھ کر سمجھ جاتے تھے کہ یہ شخص کونسا گناہ کرکے آیا ہے، ایک مرتبہ کسی مسجد کی نالی سے پانی بہہ رہا تھا، فرمایا کہ یہ غسل جنابت کا پانی ہے، کوئی جنبی آدمی غسل کررہا ہے۔ حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی اسی طرح منقول ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے جس بندہ سے جس راہ سے جو کام لینا ہوتا ہے، اس کے اندر وہی صفات وخصوصیات ویسی ہی صلاحیت پیدا فرمادیتا ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے کشف تو ہوتا نہیں؛ لیکن بعض لوگوں کی تحریر دیکھ کر میں اس کی طبیعت اور مزاج کا اندازہ لگالیتا ہوں، اور اسی اعتبار سے اس کا جواب لکھتا ہوں۔ بعض لوگ آتے ہیں اُن کی شکل وصورت دیکھ کر اندازہ لگالیتا ہوں اور وقت پر اللہ کی طرف سے مجھ پر القاء کردیا جاتا ہے، اس سے آدمی کو بھانپ لیتا ہوں، اور اسی اعتبار سے اس کی اصلاح کرتا ہوں، اور الحمدللہ وہ بالکل صحیح واقع کے مطابق ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کو جس سے جو کام لینا ہوتا ہے فطرۃً اللہ تعالیٰ اس کے اندر اُسی کے مطابق لیاقت وصلاحیت پیدا کردیتا ہے۔

صحابہ کرام کا مقام ومرتبہ

لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارُ، وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۔اس آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ سے بغض رکھنے والا جہنمی ہوگا، صحابہ کی مثال تو ایسی ہے کہ شروع شروع میں ایسا تھا جیسے پودے کا اکھوا، پھر بڑا ہوا جڑیں مضبوط ہوئیں، درخت بنا، اپنے اوپر کھڑا ہوگیا، پھل آئے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی شروع میں ایسے ہی کمزور تھے، اللہ تعالیٰ نے دھیرے دھیرے اُن کو ترقی دی، اُن کے ایمان کو مضبوط کیا، پھر یہاں تک پہنچایا کہ اس میں پھل آنے لگے، یعنی ان کے ذریعہ دوسروں کو ہدایت ہوئی اور سارے عالم میں اسلام چمکا۔

لیکن بعض لوگ ہوتے ہیں کہ ان کو صحابہ کی غلطیاں نکالنے اور اچھالنے میں مزہ آتا ہے، ایک صاحب نے مختلف صحابہ کی غلطیاں نکالی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے یہ غلطی ہوئی، عمر فاروقؓ سے یہ غلطی ہوئی، عثمان غنیؓ سے یہ غلطی ہوئی، جنگ جمل میں فلاں سے غلطی ہوئی، وہ غلطیوں کو اچھالا کرتے ہیں، ارے اس سے کیا فائدہ؟ ہاں یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ بڑے آدمی پر حملہ کرنے اور بڑے آدمی کی غلطیاں نکالنے سے آدمی بڑا بن جاتا ہے، یعنی اس کی شہرت ہوجاتی ہے، اور ان کی دیکھا دیکھی ان کے نقش قدم پر چلنے والے چُھٹ بھیا مولی اور گاجر بیچنے والے بالکل اَن پڑھ جاہل وہ بھی صحابہ کرام کی غلطیاں نکالا کرتے ہیں کہ ابوبکر صدیق سے یہ غلطی ہوئی، عمر فاروق سے یہ غلطی ہوئی، فلاں سے یہ غلطی ہوئی، ان کو اور کچھ یاد ہو یا نہ ہو؛ لیکن صحابہ کی غلطیاں ضرور یاد ہیں، اپنی غلطیاں، اپنی خطائیں انہیں یاد نہیں، نماز میں کیا پڑھا جاتا ہے، دعاء قنوت، اذان کے بعد کی دعاء، وہ صحیح یاد نہ ہوگی؛ لیکن صحابہ کی غلطیاں یاد ہیں، وہ یاد کی ہیں اور یاد کرائی گئی ہیں، اس لئے یاد ہیں، اللہ حفاظت فرمائے بڑے فتنہ کا دور ہے، اللہ تعالیٰ نے تو صحابہ سے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا، اور اپنی رضامندی کا پروانہ سنایا، اور یہ ان کی غلطیاں نکال رہے ہیں، ارے ان کی غلطیاں اور ان کی خطاؤں کو مت دیکھو، اپنی خطائیں دیکھو، اپنی فکر کرو۔ تمت سورۃ الفتح۔

○❖○

عیدالفطر کے مسنون اعمال

مولانا مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی وادی مصطفیٰ، شاہین نگر، حیدرآباد

نقشۂ دنیا پر بسنے والی تمام ہی اقوام وملل کا یہ دستور اور طریقۂ کار رہا ہے کہ وہ سال کے کچھ دن بطور جشنِ مسرت کے مناتے ہیں جسے عرف عام میں ''عید'' یا ''تہوار'' کہا جاتا ہے، ہر قوم وملت کے خوشی اور عید منانے کے طریقے جداگانہ ہوسکتے ہیں؛ لیکن مقصود سب کا ''خوشی منانا'' ہوتا ہے، اسلام چونکہ دین فطرت ہے، یہ انسان کی نفسیات کی رعایت کرتا ہے؛ اس لئے اس نے اپنے ماننے والوں کے لئے بھی دو دن بطور ''عید'' اور ''جشن مسرت'' کے عطا کئے ہیں؛ چونکہ یہ انسانی طبیعت اور فطرت کا تقاضا بھی ہے کہ انسان زندگی کی یکسانیت سے اکتاتا ہے، وہ کچھ وقت اور لمحات اور شب وروز، روزانہ کے معمول سے ہٹ کر ہنس بول کر خوشی اور مسرت کے اظہار کے ساتھ گذارنا چاہتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ہجرت کے بعد) رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے (اہل مدینہ نے) دو دن کھیل کود کے لیے مقرر کر رکھے تھے آپ ﷺ نے پوچھا: یہ دو دن کیسے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ زمانہ جاہلیت میں ہم ان دنوں میں کھیلا کرتے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان دنوں کے بدلہ میں تمہیں ان دنوں سے بہتر دو دن عطا فرمائے ہیں ایک یوم الاضحیٰ اور دوسرا یوم الفطر۔ (سنن ابوداؤد)

لیکن اسلامی اعیاد کا امتیاز یہ ہے کہ یہاں ہر موقع سے خواہ وہ مسرت وشادمانی اور فرط وانبساط کے مشروع مواقع ہی کیوں نہ ہوں؛ لیکن اسلامی حدود وقیود کی پابندی کرنی ہوتی ہے، ہر عمل کا طریقہ کار ہوتا ہے، نہ یہ کہ دوسری اقوام کے مانند شتر بے مہار کے مثل خوشی اور مسرت اور عید وتہوار کے نام پر اخلاقی اور انسانی اقدار وروایات کا قتل وخون کیا جائے، ہر طرح کی موج مستی اور عیش کوشی اور حیوانیت کی اجازت دی جائے کہ خوشی کے موقع سے انسان انسانیت کے لبادہ سے نکل کر حیوانیت اور بربریت پر اتر آئے؛ بلکہ ہر کام کا طریقۂ کار اور اس کے اصول ہوتے ہیں، جن کو پیش نظر رکھ کر وہ عمل انجام دیا جاتا ہے، خصوصاً عید الفطر کی مسرت وشادمانی کی گھڑی جو منائی جاتی ہے وہ رمضان کے طویل، صبر آزما، عبادتوں وریاضتوں سے معمور جدوجہد کے بعد، جب بندہ ایک مہینہ کے روزے، راتوں کی طویل تراویح، شب گذاری،

تلاوتِ قرآن ان اعمال سے جب اللہ کا قرب حاصل کرتا ہے تو اس کے بعد اس کو ان صبر آزما اور مشقت آمیز اعمال کو بخیر وخوبی انجام دینے پر یہ عید کی مسرتیں اور شادمانیاں عطا کی جاتی ہیں، پھر ان عید کے اعمال کو بھی سنت کے مطابق انجام دینا ہے، یہاں بھی قدم قدم پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو بروئے کار لاتے ہوئے عید منانی ہے، نہ یہ اپنی من مانی اور نفسانی طریق کو اپنانا ہے، شریعت کی روشنی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات کے مطابق عید کے اعمال کو انجام دینا ہے۔

(۱) عید الفطر کی نماز پڑھنے میں کسی قدر تاخیر مسنون ہے، اور عید الأضحیٰ کی نماز پڑھنے میں جلدی کرنا مستحب ہے؛ کیونکہ عید الفطر میں نماز سے پہلے صدقۂ فطر نکالنا ہوتا ہے، اور عید الأضحیٰ میں نماز کے بعد جانوروں کی قربانی کا مسئلہ ہوتا ہے، اور قربانی میں عجلت مطلوب ہے۔ (شامی ۳/۵۳ زکریا)

(۲) عید الفطر کی نماز سے پہلے مطلق نفل پڑھنا درست نہیں ہے، خواہ وہ اشراق ہو یا چاشت بلکہ مختار قول پر مکروہ ہے، نہ ہی مسجد وعیدگاہ میں صحیح ہے، اور نہ ہی گھر میں؛ البتہ نماز عید کے بعد عیدگاہ ومسجد میں نفل پڑھنا درست نہیں ہے، گھر میں درست ہے اور حضور کا عمل بھی یہی تھا۔ (درمختار مع الشامی ۱/۵۵۷)

(۳) عید خوشی اور حق تعالیٰ شانہ کی ضیافت کا دن ہے؛ اس لئے اس مناسبت سے غسل کرنا اور عمدہ سے عمدہ لباس پہننا اور عطر لگانا سنت ہے۔ (ردالمحتار ۱/۵۵۶)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: ''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن غسل فرماتے تھے''۔ (سنن ابن ماجۃ)

امام بیہقیؒ نے اس دن عمدہ لباس پہننے کے بارے میں نبی کریم ﷺ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا اثر نقل کیا ہے: ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر عید میں نئی نرم منقش چادر پہنتے تھے''۔ (بیہقی)

حضرت نافع نقل کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما عیدین میں عمدہ سے عمدہ کپڑا زیب تن فرماتے تھے'' مسجد اور عیدگاہ دونوں میں عیدین کی نماز درست ہے، البتہ عیدگاہ میں افضل ہے؛ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مبارک عیدگاہ میں پڑھنے کا رہا ہے، بلا عذر مسجد میں ادا نہیں فرمائی؛ البتہ بارش کی وجہ سے مسجد میں نماز ادا فرمائی۔ (سنن ابوداؤد، سنن ابن ماجہ)

چنانچہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ: ''نبی کریم ﷺ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن عیدگاہ تشریف لے جاتے تھے، سب سے پہلے آپ ﷺ نماز پڑھاتے، نماز سے فارغ ہونے کے بعد لوگوں کی

طرف رخ کر کے خطبہ کے لئے کھڑے ہوجاتے، اور لوگ بدستور صفوں میں بیٹھے رہتے''۔(بخاری شریف)

(۴) عید الفطر کے دن تمام روزے دار اللہ جل شانہ کے مہمان ہیں، اس لئے اللہ تعالی کی ضیافت کی طرف سبقت کرتے ہوئے عید الفطر کی نماز سے پہلے ایک یا اس سے زائد طاق کھجور کھانا مسنون ہے، اور کھجور میسر نہ ہونے کی صورت میں کوئی میٹھی چیز کھانا مستحب ہے۔ حدیث میں ہے کہ: ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر کے روز عیدگاہ جانے سے پہلے کچھ تناول فرماتے تھے''۔(بخاری شریف)

اور ایک روایت میں ہے کہ: ''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر کے دن عیدگاہ جانے سے پہلے چند کھجور کھالیتے تھے، اور وہ بھی طاق عدد ہی کھاتے تھے''۔(سنن ترمذی)

علامہ شامی کہتے ہیں کہ: ''حدیث کی عبارت سے ظاہر ہے کہ کھجور افضل ہے، اگر کھجور میسر نہ ہو تو کوئی بھی میٹھی چیز کھالے''۔(ردالمحتار ۱/۵۵۶)

البتہ سویاں یا کسی اور میٹھی چیز کا پکانا ضروری ہی سمجھے تو یہ عمل شریعت کے خلاف ہوگا۔ جیسا کہ ہمارے یہاں یہ رواج ہے کہ عید کے دن کھجور اور دودھ سے افطار کیا جاتا ہے، یہ عمل غیر مشروع اور بدعت ہے۔(البحر الرائق: ۲/۱۷۰)

(۵) نماز عید کے لئے مسجد جانا ہو یا عیدگاہ کی طرف، بہرصورت پیدل جانا مستحب ہے؛ کیونکہ اس میں تواضع ہے، اگر کوئی گاڑی یا کسی دوسری سواری سے عید کی نماز پڑھنے جائے، تو نہ کوئی گناہ ہے، اور نہ کراہت، صرف خلاف اولی ہے؛ البتہ واپسی میں سوار ہوکر بھی آیا جاسکتا ہے، اس میں کوئی کراہت نہیں ہے؛ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: ''اللہ کے رسول ﷺ عید کے لئے پیدل چل کر آتے اور پیدل واپس جاتے تھے''۔(سنن ابن ماجہ) اسی طرح کا اثر حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بھی منقول ہے۔(سنن ترمذی)

''اگر کوئی شخص پاپیادہ چلنے پر قادر ہو، تو عیدگاہ پیدل جانا مستحب ہے؛ اس لئے کہ یہ تواضع سے قریب تر ہے، ویسے سواری سے بھی جانا مکروہ نہیں ہے''۔(کبیری ۵۲۴)

(۶) عیدین میں بکثرت تکبیر کہنا بھی مسنون ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''اپنی عیدوں کو تکبیر سے مزین کرو''۔(کنز العمال)

عید الفطر کے موقع سے جہرا (زور سے) تکبیر نہ کہے۔(البحر الرائق ۲/۱۷۲) بہرحال ہر دم اللہ کی بڑائی اور عظمت کا خیال ذہن ودماغ میں ہو، اس کی یاد سے زبان تر رہے، ایسا نہیں کہ خوشی کے موقع سے اللہ کی

یاداوراس کے استحضار سے غفلت برتی جائے۔

(۷) اور یہ بھی مسنون ہے کہ جس راستے سے عیدگاہ جائے، اس کے علاوہ دوسرے راستہ سے واپس آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی معمول یہی تھا کہ جس راستہ سے عیدگاہ تشریف لے جاتے، اسی راستہ سے واپس نہ ہوتے؛ بلکہ دوسرا راستہ اختیار فرماتے۔ (بخاری، ترمذی)

(۸) عیدگاہ جانے سے قبل صدقۂ فطر بھی ادا کردے، صدقۂ فطر ہر مسلمان عاقل وبالغ پر جو نصاب یا اس کے مساوی مال کا مالک ہو واجب ہے، خواہ یہ نصاب نقدی کی شکل میں ہو یا مال تجارت کی شکل میں یا رہائشی مکان کی شکل میں، اس کو نماز عید سے پہلے ادا کرنا اس لئے ہے کہ غرباء اور فقراء بھی عید کی خوشیوں میں سب کے برابر شریک رہیں، نصف صاع یعنی دو پونے دو سیر گیہوں یا اس کی قیمت ادا کرے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے آخری دنوں میں لوگوں سے کہا کہ تم اپنے روزوں کی زکوۃ نکالو (یعنی صدقۂ فطر نکالو) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ صدقہ ہر مسلمان آزاد وغلام مرد وعورت اور چھوٹے بڑے پر کھجور اور جو میں سے ایک صاع اور گیہوں میں سے نصف صاع قرار دیا ہے۔ (سنن ابوداؤد)

نماز عید کی ترکیب

نماز عید کی تکبیرات میں عموماً غلطیاں ہوتی ہیں، یعنی کونسی تکبیر کے وقت ہاتھ اٹھائے اور کب نہیں، ہاتھ کب چھوڑے اور کب باندھے، پہلی رکعت میں تکبیر تحریمہ کے ساتھ کل چار تکبیریں ہیں، چاروں تکبیروں میں کانوں تک ہاتھ اٹھائے اور پہلی اور چوتھی تکبیر کے وقت ہاتھ باندھ لے، یہ یاد رکھ لے جہاں تکبیر کے بعد کچھ پڑھنا ہے وہاں ہاتھ باندھ لے اور جہاں کچھ پڑھا نہیں جاتا وہاں چھوڑ دے۔

○ تکبیر اولیٰ: ہاتھ اٹھا کر باندھ لے۔ ○ تکبیر ثانیہ: ہاتھ اُٹھا کر چھوڑ دے۔ ○ تکبیر ثالثہ: ہاتھ اٹھا کر چھوڑ دے۔ ○ تکبیر رابعہ: ہاتھ اٹھا کر باندھ لے۔

اس کے بعد قرات اور رکوع وسجدہ کے ساتھ ایک رکعت مکمل دوسری رکعت میں قرات کے بعد رکوع سے پہلے چار تکبیرات کہیں گے، پہلی تین تکبیروں میں ہاتھ اٹھا کر چھوڑ دے اور چوتھی تکبیر میں ہاتھ اٹھائے بغیر تکبیر کہتے ہوئے رکوع میں چلا جائے۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۶/۱۷۱)

اگر ان مسنون اعمال اور امور کی رعایت کے ساتھ ہم نماز عید کی ادائیگی کا اہتمام کریں گے تو نہ صرف یہ کہ ہمیں عید کی خوشیاں اور مسرتیں حاصل ہوں گی؛ بلکہ ساتھ ہی ساتھ سنت طریقے پر اس کے اہتمام کی وجہ سے ہمارا عید کا ہر عمل ہمارے لئے عبادت بن جائے گا، اللہ ہمیں توفیق ارزانی عطا کرے۔ ○❖○

مسلمان اپنے اَسلاف کی قربانیوں کو یاد کریں!

حضرت مولانا اسرارالحق صاحب قاسمی (ایم پی) وصدر آل انڈیا تعلیمی وملی فاؤنڈیشن ذاکر نگر، نئی دہلی

جنگ آزادی کا جب بھی ذکر ہوتا ہے تو اس کے ایک انتہائی اہم ترین پہلو کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس پہلو کا تعلق مسلمانوں اور ان کے علماء کرام کی ان قربانیوں سے ہے جن پر ملک کی جدوجہد آزادی کی بنیاد تعمیر ہوئی تھی۔ ہمیں یہ اعتراف کرنے میں کوئی تکلف نہیں کہ جنگ آزادی میں ملک کے تمام طبقات نے حصہ لیا لیکن مسلمانوں نے جس جوش ایمانی اور جذبہ حب الوطنی کے ساتھ جنگ لڑی اس کا کوئی موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ کیا کوئی دوسری قوم اس کی مثال پیش کرسکتی ہے کہ اس کے مذہبی پیشواؤں نے اتنی بڑی تعداد میں جنگ آزادی میں خود کو قربان کر دیا ہو؟ ہزاروں علما کو پھانسی پر چڑھایا گیا۔ ملک جن حالات سے گزر رہا ہے ان میں اس کی توقع اور شکایت کرنا ہی فضول ہے کہ جنگ آزادی کے تذکروں میں مسلمانوں اور علما کی قربانیوں کو یاد نہیں کیا جاتا۔ اب تشویش کا پہلو دوسرا ہے۔ سنگھی نظریات کے حامل افسروں نے آزادی کی تاریخ کو جس طرح عملاً توڑ مروڑ کر رکھ دیا ہے اس کی زد میں براہ راست مسلمانوں اور علما کا یہی طبقہ آیا ہے۔ ایسے میں کس کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان علما کی قربانیوں کے تذکروں کو زندہ کرکے انہیں اپنی نسلوں کے ذہنوں میں نقش کردے؟ کیا یہ کام ایک خاص ذہن رکھنے والے افراد کی حکومت کرسکتی ہے؟ کیا یہ کام وہ افسران کرسکتے ہیں جنہوں نے آر ایس ایس کی چاکری کا ذمہ اٹھا رکھا ہے؟ آج مسلمانوں، ان کے قائدین اور خود مدارس اسلامیہ کو اس پہلو پر غور کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

مسلمان جنگِ آزادی میں رضا کارانہ نہیں بلکہ قائدانہ اور سرفروشانہ جذبے کے ساتھ لڑے۔ انہوں نے 1757ء سے 1947ء تک دسیوں محاذوں پر انگریزوں کے پاؤں اکھاڑے۔ کم وبیش اس دوسو سال کے عرصہ میں انگریزوں کے خلاف جاری تحریکوں کے سرخیل وہی رہے۔ 1857ء میں انہوں نے برادرانِ وطن کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف منظّم جنگ چھیڑی۔ اور اس میں بھی انہوں نے اس کا خیال رکھا کہ برادران وطن کو تحریک میں نمبر دو کی نہیں بلکہ نمبر ایک کی حیثیت حاصل رہے۔ اس کا سب

سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب علماء کی ایک بڑی مجلس میں اس پر غور ہو رہا تھا کہ اقوام عالم کو ہندوستان کی جدوجہد آزادی سے باخبر کرنے اور ان کی حمایت حاصل کرنے کے لئے کس کو قائدانہ کردار میں بھیجا جائے تو یہ علما ہی تھے جنہوں نے اس کردار کے لئے کسی مسلمان، کسی امام یا کسی عالم دین کا نہیں بلکہ موہن داس کرم چند گاندھی کا نام پیش کیا تھا۔ یہی نہیں علما اور مسلمانوں نے چندہ کر کے گاندھی کو تیس ملکوں کے دورہ پر بھیجا اور انہیں موہن داس کرم چند گاندھی سے مہاتما گاندھی بنا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک کا ایسا کوئی گوشہ نہیں جہاں مسلمانوں نے جدوجہدِ آزادی کے سلسلہ میں اپنا کوئی نقش نہ چھوڑا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ آزادی کے بعد سے اب تک ملک میں کئی شدت پسند جماعتیں آزادی کے تعلق سے علماء کرام کی قربانیوں کو دبانے میں سرگرم عمل رہی ہیں اور آج بھی ان کی یہ مذموم حرکت بند نہیں ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ تاریخِ آزادی کے عنوان سے لکھی جانے والی بیشتر کتابوں میں ان مجاہدین علماء کا یا تو نام ہی نہیں ہے یا کہیں ان میں سے بعض کا ہلکا سا تذکرہ کر دیا گیا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس تحریک میں مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کے علما اور عوام نے ایک پلیٹ فارم پر آ کر جان ڈال دی تھی۔ اس اعتبار سے تمام مدارس اسلامیہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان تمام علما کی قربانیوں سے نئی نسل کو واقف کرائیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اٹھارہویں صدی کی تیسری دہائی میں ہی، جبکہ ہندوستان میں انگریزوں کے قدم جمے نہیں تھے، مستقبل کے خطرات کو بھانپ لیا تھا اور علمی، فکری و تصنیفی سطح پر ان کے خلاف جنگ چھیڑ دی تھی، ان کے بعد ان کے اخلاف اور صاحبزادوں نے اس کا بیڑہ اٹھایا، شاہ عبدالعزیز، سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی قربانیاں اور ان کی تحریکِ جہاد اور علمائے صادق پور کے ولولہ خیز معرکے، یہ سب تو مسلمانوں ہی کی طرف سے ہندوستان کی آزادی کی خاطر برپا کیے گئے تھے۔ پھر تحریکِ آزادی کے دوسرے دور میں فکرِ ولی اللّٰہی کے حقیقی علمبردار علمائے دیوبند نے جنگِ آزادی میں نہ صرف زبردست قربانیاں دیں بلکہ انہوں نے ملک کی آزادی میں قائدانہ کردار ادا کیا۔ دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے 1857ء کی جنگ آزادی میں 14 ستمبر 1857ء کو بہ نفس نفیس حصہ لیا اور اپنے رفقاء حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت ضامن شہید اور حضرت مولانا منیرالدین کے ساتھ مل کر شاملی ضلع مظفر نگر میں اپنی بہادری اور شجاعت کے جوہر دکھائے اور انگریزوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی قیادت میں یہ جنگ لڑی گئی اس میں حضرت ضامن شہید

اور بہت سے مجاہدین شہید ہوگئے۔اگرچہ بدقسمتی سے اس وقت کے سیاسی حالات نے انہیں شاملی سے آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا مگران کے قائم کردہ مدرسہ دارالعلوم دیوبند کی کوکھ سے بڑے بڑے مجاہدین آزادی تیار ہوئے جنہوں نے جنگ آزادی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ انہی عظیم مجاہدین میں سے ایک تھے۔انہوں نے ہندوستان کوآزادکرانے کے لئے تحریکِ ''ریشمی رومال'' شروع کی جوخفیہ اور بہت منظّم تحریک تھی۔اس تحریک کوکامیاب بنانے کے لئے انہوں نے خودحجازِ مقدس کا سفرکیااوراپنے قریبی ساتھیوں کو بیرونِ ملک روانہ کیا۔قریب تھا کہ اس کا کوئی بہترنتیجہ نکلتا،مگراس خفیہ تحریک کا انکشاف ہوگیا،پھرحضرت شیخ الہندؒکوگرفتار کرلیا گیااور مالٹا بھیج دیا گیا۔جب آپ وہاں سے رہا ہوکر ہندوستان آئے تو بہت کچھ تبدیل ہو چکا تھا؛ لیکن پھربھی انہوں نے ملک میں چلنے والی تحریکوں کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑے رکھااوران میں آزادی کی روح پھونک کر 1921ء میں اس دارفانی سے رختِ سفر باندھ لیا۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ جدوجہدِ آزادی کی تمام تر سرگرمیوں میں حضرت شیخ الہندؒ کے دست و بازو تھے، انھوں نے آزادی کی خاطراپنی زندگی کے انتہائی قیمتی 25 سال جلاوطنی میں گزارے،شیخ الہندؒکی تحریک کوفروغ دینے کے لئے وہ افغانستان اس حالت میں گئے کہ جوان العمر تھےاوران کی ڈاڑھی کے بال سیاہ تھے،مگرجب لوٹے تو بڑھاپے میں قدم رکھ چکے تھے۔انہوں نے کابل میں کانگریس کمیٹی قائم کی اورانڈین نیشنل کانگریس سے اس کاالحاق کیا۔افغانستان میں راجہ مہندر پرتاپ کی سربراہی میں جوآزاد حکومت قائم ہوئی وہ اس کے بھی اہم رکن تھے۔مولانا منصورانصاری بھی حضرت شیخ الہندؒکی تحریک کے اہم رکن تھے۔وہ حضرت شیخ الہند کے آخری سفرحج 1915ء میں شریک سفر تھے۔ان کو یاغستان کے علاقہ میں بھیجا گیا تھا۔حضرت شیخ الہندؒکی گرفتاری کے بعدوہ افغانستان چلے گئے۔حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کی خواہش تھی کہ ہندستان کے آزادہوتے ہی وہ مولانا منصورانصاریؒ کوہندوستان بلالیں گے۔لیکن 1946ء میں ان کاانتقال ہوگیااورجس ملک کی آزادی کے لیےانہوں نے 31 سال جلاوطنی کی زندگی گذاری تھی،اسے نہ دیکھ سکے۔(تاریخ دارالعلوم،جلددوم)

تحریکِ آزادی کا اہم عنوان شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ بھی تھے۔آپ حضرت شیخ الہندؒ کے ان رفقاء میں شامل تھے جن کو حجاز میں گرفتار کیا گیا اور جو مالٹامیں جنگی قیدی کی حیثیت سے رہے۔

1920ء میں مالٹا سے رہائی کے بعد پورے جوش وخروش کے ساتھ تحریک آزادی کو آگے بڑھایا، جیل خانوں کو آباد کیا اور اپنے جذبہ وحوصلہ سے انگریزوں کو چنے چبوادیئے۔ آپ اس وقت تک آزادی کی جدوجہد کرتے رہے۔ جب تک کہ ملک آزاد نہیں ہوگیا۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ، مفتی کفایت اللہ شاہجہاں پوریؒ، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا فضل حق خیرآبادیؒ اور مولانا ابوالمحاسن سجاد بہاریؒ جیسے سینکڑوں علما آزادی کے ان متوالوں میں تھے جنہوں نے تحریکِ آزادی کی قیادت کی اور ان کی صحبت سے بڑے بڑے لیڈران پیدا ہوئے۔

مولانا محمد علی جوہرؒ نے تحریکِ آزادی کو فروغ دینے کے لیے ''ہمدرد'' اور ''کامریڈ'' نامی اخبارات نکالے، جنہوں نے پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف باشندگانِ ہند کو اشتعال دلایا اور انگریزوں سے ٹکر لینے کے لئے تیار کیا۔ بعد میں انگریزی حکومت نے ان دونوں اخباروں پر پابندی لگادی۔ مولانا محمد علی جوہر نے تحریک خلافت میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا وہ جیل بھی گئے اور بالآخر آزادیِ وطن کی جدوجہد میں ہی دیارِ غیر میں جان جاں آفریں سپرد کی۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے آزادی کی تحریک میں زبردست مجاہدانہ اور قائدانہ کردار ادا کیا۔ اپنی پرمغز اور جوشیلی تقریروں سے آزادی کی فضا قائم کی۔ انہوں نے ''الہلال'' و ''البلاغ'' نکالے، جن کے ذریعہ اہلِ وطن کو بیدار کیا، قید وبند کی اذیتیں برداشت کیں۔ قدرت نے انہیں قیادت کی فطری صلاحتیں عطا کی تھیں۔ انہوں نے جدوجہد آزادی کے مختلف مرحلوں میں گاندھی جی، انڈین نیشنل کانگریس اور ہندوستانی قوم کو رہنمایانہ خطوط دیئے اور قومی قیادت کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔ جنگ آزادی کی تاریخ میں یہ تو چند بڑے بڑے نام ہیں، جن میں مذکورہ اشخاص کے ساتھ علامہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری، عظیم اللہ خاں، حافظ رحمت اللہ روہیل کھنڈ، بدرالدین طیب جی، مولانا برکت اللہ بھوپالی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، حسن امام، خان عبدالغفار خاں، مولانا مظہر الحق، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، ملا جان محمد، سید بدرالدجیٰ، ڈاکٹر سید محمود اور شفیع داودی جیسی بے شمار شخصیتیں بھی شامل ہیں۔ مگر ان رہنماؤں کے علاوہ جنگ آزادی میں عام مسلمانوں نے بھی نمایاں رول ادا کیا ہے اور جہاں تک جان کی قربانی کا سوال ہے تو 1831ء میں بالاکوٹ کے میدان میں، 1857ء کی جنگ

آزادی میں، 1919ء میں جلیانوالہ باغ میں، 22-1920ء کے دوران تحریک 'عدم تعاون' میں۔ 1921ء میں موپلا بغاوت میں، 1922ء میں چوراچوری پولس فائرنگ میں، 1930 میں تحریک سول نافرمانی ونمک آندولن میں، 1942ء میں ہندوستان چھوڑو تحریک میں، 46-1942ء کے دوران آزاد ہندفوج اور 1946ء میں ممبئی میں بحری بیڑے کی بغاوت کی حمایت میں ہونے والے مظاہروں پر پولس فائرنگ کے دوران ہزاروں مسلمان شہید ہوئے۔ یہ وہ شہداء ہیں جن کا نام تاریخ کے اوراق میں اجمالاً تو ملتا ہے؛ لیکن سرکاری یا غیر سرکاری طور پر ان کی شہادتوں کا کہیں اعتراف نہیں کیا جاتا۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ رفتہ رفتہ خود مسلمانوں میں بھی اپنے اسلاف کی قربانیوں اور اس ملک کی آزادی، تعمیر وترقی میں ان کی جدوجہد کو بھولنے کا رجحان تیزی سے بڑھتا جارہا ہے۔ 15/اگست اور 26/جنوری ہر سال آتے ہیں جن میں مجاہدینِ آزادی کو یاد کیا جاتا اور انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا ہے، مگر ایسے لوگوں کی فہرست میں چند ہی نام ہوتے ہیں۔ اولاً تو اس میں مسلم مجاہدین کا کوئی تذکرہ ہی نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو وہ مولانا ابوالکلام آزاد یا دو تین مزید ناموں تک محدود ہوجاتا ہے۔ فی الوقت مرکزی اقتدار پر جس جماعت کا قبضہ ہے، اس کے کارکن، وزراء اور ساری مشینری اندرونی طور پر ایک ہمہ گیر تبدیلی وتحریف پر آمادہ ہے۔ وہ تعلیمی نصاب کو بھی بدل دینا چاہتی ہے اور آزادی کی تاریخ کو بھی پلٹنے کے درپے ہے۔ ایسے میں آنے والے 'یومِ جمہوریہ' کے موقع پر ملک بھر کے مسلمان اپنے اپنے تعلیمی اداروں میں خصوصی پروگرام کریں، جن میں آزادی کی جنگ میں مسلمانوں کی قربانیوں کا ذکر کیا جائے، انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا جائے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کا عزم کیا جائے۔ اسی طرح آزادی کے بعد سے لے کر اب تک کی تاریخ میں اس ملک کو بنانے اور سنوارنے اور اس کے تحفظ میں مسلمانوں کے کردار پر روشنی ڈالی جائے۔ ان پروگراموں میں ہم مسلم دانشوران، عوام، نوجوان نسل کے ساتھ برادرانِ وطن کو بھی شامل کریں تاکہ انھیں حقیقت کا پتہ چلے اور ہماری آنے والی نسل کو اپنے آباواجداد کی قربانیوں کا علم ہو۔

❍❖❍

حرمین شریفین کی خصوصیات و اِمتیازات

مولانا مفتی محمد اجمل قاسمی استاذ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد

یہ ساری زمین مادی حیثیت سے یکساں نہیں، کوئی حصہ زرخیز اور وسائل زندگی سے لبریز ہے تو کوئی بنجر اور بے فیض ہے، کہیں گل پوش پہاڑیاں، ہری بھری وادیاں اور شاداب سبزہ زار ہیں، تو کہیں جھلسے ریگستان، بے آب و گیاہ میدان اور لق ودق ویرانے ہیں، ٹھیک اسی طرح دینی اور روحانی حیثیت سے بھی زمین کے تمام مقامات برابر نہیں ہے، یوں تو یہ ساری ہی زمین ایسی پاک ہے کہ اُس کے ہر حصہ پر نماز ادا کی جاسکتی ہے، اور اللہ کو یاد کیا جاسکتا ہے؛ لیکن پھر بھی دینی اور روحانی حیثیت سے بازار اس روئے زمین کی بدترین جگہیں ہیں اور مسجدیں سب سے بہتر مقامات ہیں، عام جگہوں پر مسجدوں کو یہ روحانی فوقیت حاصل ہے کہ اس میں ادا کی جانے والی ایک نماز عام جگہوں پر ادا کی جانے والی نماز سے کئی گنا زیادہ فضیلت رکھتی ہے، پھر ان مساجد میں جو جامع مسجد کی حیثیت رکھتی ہیں، اُن کا روحانی مقام عام مساجد سے سِوا ہوتا ہے، اس لئے اس میں ادا کی جانے والی نماز عام مساجد کی نماز سے فضیلت اور ثواب کے اعتبار سے بدرجہا بہتر ہوتی ہے، پھر اِس سے آگے مسجدِ اَقصیٰ، مسجد نبوی اور مسجد حرام اِس روئے زمین کے سب سے مقدس اور متبرک مقامات ہیں، اس لئے اِن مقامات کے تقدس اور فضیلت کے اعتبار سے یہاں پر ادا کی جانے والی نمازوں کا ثواب بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مسجد حرام کا تقدس اور عظمت چوں کہ اِن تینوں مقامات میں سب سے زیادہ ہے، اس لئے یہاں ادا کی جانے والی نماز کا ثواب اپنی آخری انتہاء کو پہنچ جاتا ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس روئے زمین پر اُترنے والی انوار وتجلیات اور رحمتوں اور عنایتوں کی بارشیں ہر طرف سے سمٹ کر مسجدوں میں جمع ہوتی ہیں اور پھر عام مساجد سے ان کا بہاؤ جامع مسجدوں کی طرف ہوتا ہے، اور پھر وہاں سے مسجد اَقصیٰ اور مسجد نبوی سے گذرتے ہوئے مسجد حرام میں جمع ہوجاتی ہے، جیسے آسمان سے اُترنے والی بارش دریاؤں میں جمع ہوکر سمندروں میں جا گرتی ہے، گویا کہ مسجد حرام کا حرم محترم آسمان سے اُترنے والی تجلیات کا آخری نقطہ اور مرکز ہے۔

یا دوسرے الفاظ؛ بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ مسجد حرام درحقیقت انوار الٰہی کا مطلع اور آسمان سے اُترنے والی رحمتوں کی جائے نزول ہے، یہیں سے انوار الٰہی کی کرنیں اور رحمتِ الٰہی کی گھٹائیں اُٹھ کر سب سے پہلے مسجد نبوی اور پھر مسجد اقصیٰ پہنچتی ہیں، اور پھر وہاں سے یہ سلسلہ دراز ہوکر جامع مسجدوں اور عام مساجد سے ہوتا ہوا پورے روئے زمین کو فیض یاب کرتا ہے، اور نورِ ایمان وعرفان سے آباد دلوں کو منور ومعمور کرتا ہے۔ سرزمین مکہ اور مدینہ کا وہ مبارک حصہ جسے دینی اور روحانی اعتبار سے زمین کے مرکز اور صدر مقام کی حیثیت حاصل ہے، اُسے اللہ اور اُس کے رسول نے اپنا حرم یعنی اپنا خاص محفوظ علاقہ قرار دیا ہے۔ اس مضمون میں ان دونوں مقدس مقامات کی کچھ اہم اور مشہور خصوصیات اور امتیازات کا مختصر تذکرہ کیا جائے گا۔

''حرم'' عربی زبان کا لفظ ہے، جس میں ''حفاظت، تقدس اور احترام'' کا معنی پایا جاتا ہے، چناں چہ عربی میں ''حَرَمُ الرَّجُلِ'' ہر اُس چیز پر بولا جاتا ہے جس کی حفاظت اور دفاع کو آدمی اپنے لئے ضروری خیال کرتا ہے، جو جگہ محترم اور مقدس ہو، اُسے عربی میں ''اَلْحَرِیْمُ'' کہا جاتا ہے۔ اسی طرح آدمی جب کسی کی پناہ میں آکر قتل اور بے آبروئی سے محفوظ ہوجائے تو کہا جاتا ہے: ''أَحْرَمَ الرَّجُلُ بِفُلَانٍ'' (آدمی نے اُس کی پناہ حاصل کرلی) (القاموس الوحید ۳۳۱)

حرمین شریفین مکہ اور مدینہ چوں کہ انتہائی مقدس اور محترم ہیں، اور وہ مقامات ہیں جہاں آدمی تو آدمی جاندار اور نباتات بھی محفوظ اور مامون ہوتے ہیں، اس لئے ان دونوں کو حرم کہا جاتا ہے۔

''حرمین شریفین'' جب بولا جاتا ہے تو اس سے ''حرمِ مکی'' اور ''حرمِ مدنی'' مراد ہوتے ہیں۔ ''حرمِ مکی'' مکہ اور اُس کے قرب وجوار کے مخصوص علاقے کو کہا جاتا ہے، جس کا کل رقبہ ۵۰۰ر مربع کلومیٹر ہے، اور حرم کے محیط دائرے کی کل مسافت ۱۲۷ر کلومیٹر ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت جبرئیل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حدودِ حرم سے آگاہ فرمایا تھا، اور انہیں حرم کی سرحدوں پر علامتی پتھر بطور نشان کے نصب کرنے کا حکم دیا تھا، اِس طرح سب سے پہلے حدودِ حرم کی تعیین کی فضیلت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حصہ میں آئی۔ پھر فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت تمیم بن اسعد خزاعی رضی اللہ عنہ کو حدودِ حرم کی تعیین وتجدید کے لئے بھیجا، چناں چہ اُنہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان اور منشاء کے مطابق حدودِ حرم کی تجدید فرمائی۔ پھر خلفاء اور سلاطین مختلف

اوقات میں حدودِ حرم پر علامتی پتھر نصب کرتے رہے، مگر زمانے کے ساتھ ساتھ یہ علامتیں عموماً مٹ گئیں؛ البتہ جن اہم علامتوں کی مرمت اور تجدید کا اہتمام ہوتا رہا وہ باقی رہیں۔ (تاریخ مکہ ۱۴-۱۵ مؤلفہ: ڈاکٹر محمد الیاس عبدالغنی)

جہاں تک تعلق ہے ''حرمِ مدنی'' کا، تو یہ مدینہ منورہ کے اُس حصہ کو کہا جاتا ہے جو شہر کے دو قدیم محلے حرہ مشرقی اور حرہ مغربی کے درمیان واقع ہے، اور شمال وجنوب سے حرم کی حد بندی ''عیر'' اور ''ثور'' نامی دو پہاڑیوں کے ذریعہ ہوتی ہے، جو آمنے سامنے واقع ہیں، اور دونوں کا درمیانی فاصلہ تقریباً پندرہ کلومیٹر ہے۔ (تاریخ مدینہ ۸، مؤلفہ: ڈاکٹر محمد الیاس عبدالغنی)

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کو اللہ اور اُس کے رسول سے خصوصی تعلق حاصل ہے، جو دنیا کے کسی اور شہر کو حاصل نہیں، اِس تعلق خاص نے ان دونوں شہروں کو عجیب وغریب محبوبیت اور ہر دل عزیزی عطا کی ہے، دل ان کی طرف لپکتے ہیں، آنکھیں اُن کے دیدار کو ترستی ہیں، زائر حرم یہاں کی پہاڑیوں، وادیوں، یادگاروں، نشانیوں حتیٰ کہ شجر وحجر کو بھی عقیدت ومحبت اور عظمت واحترام کی نظر سے دیکھتا ہے۔ دنیا کے بادشاہوں کا ایک محفوظ علاقہ ہوتا ہے، جہاں ہتھیار اُٹھانے کی ممانعت ہوتی ہے، اس محفوظ علاقے کے رہنے والے خاص لباس وآداب کے پابند ہوتے ہیں، جن کی خلاف ورزی بادشاہ کی توہین سمجھی جاتی ہے، اور خلاف ورزی کا مرتکب سخت سزاؤں کا مستحق قرار پاتا ہے، یہ دونوں مبارک شہر کائنات کے حقیقی بادشاہ اور شہنشاہِ اعظم اور اس کے مقدس رسول کا ''حرمِ خاص'' ہیں، اس محفوظ علاقے کے خاص آداب اور لباس ہیں (لباس کی خصوصیت صرف مکہ کی ہے) یہاں ہر شئ مامون ومحفوظ ہے، انسان تو انسان؛ وحشی جانور وپرندے اور خودرَو پیڑ پودوں کو بھی امن حاصل ہے، یہاں لڑائی جھگڑے، حرب وضرب قیامت تک کیلئے حرام ہیں، اُن کی تعظیم اور احترام اللہ اور اُس کے رسول ہی کی تعظیم کا حصہ ہے۔ (مستفاد از: حجۃ اللہ البالغہ ۲/۱۸۰)

حرمین شریفین کے فضائل وخصوصیات علماء نے بہت شمار کرائے ہیں، جن کا اِحاطہ اِس مختصر سی تحریر میں ممکن نہیں ہے، یہاں صرف اہم اور مشہور خصوصیات کا اِجمالی تذکرہ پیش نظر ہے، حرمین شریفین کی خصوصیات دو طرح کی ہیں، بعض وہ ہیں جو دونوں میں مشترک ہیں اور بعض وہ ہیں جو دونوں میں کسی ایک کے ساتھ خاص ہیں، پہلے نمبر وار حرمِ مکی کی خصوصیات وامتیازات کا تذکرہ کیا جائے گا، پھر حرمِ مدنی کا تذکرہ ہوگا، اور پھر دونوں کی مشترکہ خصوصیات پیش کی جائیں گی:

حرمِ مکی کی خصوصیات

(۱) خانۂ کعبہ کا جائے وقوع:

تاریخی روایات اور عارفین کے کشف کے مطابق عرشِ الٰہی کے سایے میں سب سے نچلے آسمان پر بیت المعمور واقع ہے، بیت معمور کی حیثیت آسمانِ دنیا میں وہی ہے جو زمین میں خانۂ کعبہ کی ہے، روزانہ ستر ہزار فرشتے اس مبارک گھر کا طواف کرتے ہیں، اور جو فرشتہ ایک بار طواف کر لیتا ہے، دوبارہ اُس کی باری نہیں آتی۔ بیت معمور کے ٹھیک نیچے زمین پر خانۂ کعبہ واقع ہے، جو زمین پر رحمتِ الٰہی کا مرکز اور آسمان سے اُترنے والی تجلیات وانوارات کا مطلع ہے، یہیں سے انوارِ الٰہی کی کرنیں پھوٹ کر پورے عالم میں روحانی روشنی بکھیرتی ہیں، خانۂ کعبہ کا یہ مبارک جائے وقوع خانۂ کعبہ کی اہم ترین خصوصیت ہے۔

(تاریخ مکہ للازرقی ۳۴، سیرۃ النبی ۱۹۸/۵ علامہ سلیمان ندوی)

(۲) خانۂ کعبہ سب سے پہلی مسجد ہے:

خانۂ کعبہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے بنایا جانے والا سب سے پہلا گھر ہے، ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةَ. (ال عمران: ۹۶)

لوگوں کے لئے بنایا جانے والا سب سے پہلا گھر وہ ہے جو مکہ میں ہے۔

تاریخی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے فرشتوں کو کعبہ کی تعمیر کا حکم دیا، فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق خانۂ کعبہ کی تعمیر کی اور اُس کا طواف کیا۔ پھر جب حضرت آدم علیہ السلام زمین پر اُتارے گئے، تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اُن کو بیت اللہ کے مقام اور جائے وقوع سے باخبر کیا، پھر حضرت آدم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر فرمائی اور اُس کا طواف کیا۔ (اخبار مکہ للازرقی ۳۴) غالباً فرشتوں کی تعمیر جس کا تذکرہ ابھی گذرا، وہ نزولِ آدم سے کافی پہلے عمل میں آئی تھی، اور نزولِ آدم کے وقت درازیٔ مدت کے سبب اُس کے نشانات مٹ گئے تھے، اسی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کو حضرت جبرئیل علیہ السلام کی رہبری میں خانۂ کعبہ کی تعمیرِ نو کی ضرورت پیش آئی۔ ہر دور میں انبیاء اور صلحاء اِس مبارک گھر کا طواف کرتے رہے، یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ آیا، اور اللہ تعالیٰ نے اُنہیں بیت اللہ کے جائے وقوع سے مطلع فرمایا، اور آپ نے اپنے عظیم فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام سے مل کر خانۂ کعبہ

کی تعمیر کی، اور اُس کے بعد سے یہ عمارت باقی رہی، کبھی اِس کے نشانات نہیں مٹے؛ البتہ مختلف زمانوں میں اس کی اِصلاح ومرمت کا کام ہوتا رہا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں:

سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَنْ أَوَّلِ مَسْجِدٍ وُضِعَ فِي الْأَرْضِ، فَقَالَ: اَلْمَسْجِدُ الْحَرَامُ، قُلْتُ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: اَلْمَسْجِدُ الْأَقْصىٰ، قَالَ: كَمْ بَيْنَهُمَا؟ قَالَ: أَرْبَعُوْنَ عَامًا. (أخرجه البخاري، كتاب أحاديث الأنبياء، ومسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روئے زمین پر بنائی جانے والی سب سے پہلی مسجد کے بارے میں پوچھا، تو آپ نے فرمایا کہ پہلی مسجد؛ مسجد حرام ہے، میں نے پوچھا کہ پھر کونسی؟ تو آپ نے فرمایا: مسجد اقصیٰ، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ دونوں کے درمیان مدت کتنی تھی؟ آپ نے فرمایا: چالیس سال۔

اِس حدیث پاک میں دونوں مسجدوں کی تعمیر کے درمیان چالیس سال کی جو مدت بتائی گئی ہے وہ خانۂ کعبہ کی اُس تعمیر کو پیش نظر رکھ کر بتائی گئی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں عمل میں آئی۔

(۳) خانۂ کعبہ قبلہ ہے:

حرمِ پاک کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ خانۂ کعبہ کو تمام مسلمانوں کا قبلہ قرار دیا گیا ہے:

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهُ. (البقرة: ۱۵۰)

اور تو جہاں سے نکلے اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کر، اور جہاں تم ہوا کرو (اے ایمان والو) اُسی (مسجد حرام) کی طرف اپنا منہ کرلیا کرو۔

چناں چہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں پوری دنیا کے مسلمان دن ورات میں پانچ مرتبہ صف بستہ اس قبلہ کی طرف رخ کرکے انتہائی خشوع وخضوع کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں، اور اپنے رب کے حضور میں سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ قضاء حاجت کے وقت اس طرف رخ کرنا یا پشت کرنا شریعت میں بے ادبی قرار پائی ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إِذَا أَتىٰ أَحَدُكُمُ الْغَائِطَ فَلَا يَسْتَقْبِلُ الْقِبْلَةَ وَلَا يُوَلِّهَا ظَهْرَهُ. (رواه البخاري، كتاب الوضوء / باب لا تستقبل القبلة بغائط أو بول)

جب تم میں سے کوئی قضاء حاجت کے لئے جائے تو نہ قبلہ کی طرف رخ کرے اور نہ اُس کی طرف پشت کرے۔

یہ دونوں باتیں یعنی نماز میں خانۂ کعبہ کی طرف رخ کرنا اور قضاء حاجت کے وقت اس کی طرف پیٹ یا پیٹھ کرنے سے احتراز کرنا صرف خانۂ کعبہ کی خصوصیت ہے، جس میں دنیا کا کوئی مقام شریک نہیں ہے۔

(۴) کعبہ اِنسانیت کی بقاء کا سبب ہے:

حرمِ پاک کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ عالم انسانیت کی بقاء کا رشتہ خانۂ کعبہ سے جڑا ہوا ہے، جب تک آدم کی اولاد اِس مبارک گھر کو آباد رکھے گی، اُس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتی رہے گی، یہاں حج وعمرہ اور طواف ادا ہوتے رہیں گے، یہاں پھیلے ہوئے مقدس مقامات کی اللہ اور اُس کے رسول کی تعلیم کے مطابق تعظیم ہوتی رہے گی، اس وقت تک کارخانہ عالم کا نظام جاری وساری رہے گا، اور جب یہ سلسلہ موقوف ہو جائے گا، اور شقی سیاہ فام حبشی اس مبارک گھر کو منہدم کر دے گا، تو پھر یہ عالم باقی نہ رہ سکے گا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِلنَّاسِ. (المائدة: ۹۷)

اللہ تعالیٰ نے بزرگی والے گھر کعبہ کو لوگوں کے قیام کا باعث بنایا ہے۔

(۵) خانۂ کعبہ چشمۂ برکت وہدایت ہے:

اس مبارک گھر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس گھر کے مالکِ لامکان نے اُسے سارے عالم کے لئے چشمۂ برکت اور مرکز رشد وہدایت بنایا ہے، کیا مادی اور کیا روحانی قدرت کی فیاضیوں نے ارزانی اور فراوانی کے ساتھ دونوں ہی طرح کی برکتیں اس مکان اور اس کے مکینوں پر نثار کی ہیں، بے آب وگیاہ وادی اور لق ودق صحراء کے درمیان واقع ہونے کے باوجود ہمیشہ یہاں ہر چیز کی فراوانی رہی ہے، قدیم زمانے ہی سے مکہ عرب کی منڈی اور تجارتی قافلوں کا مرکزِ توجہ رہا ہے، موسم حج میں تجارتی قافلے ہر چہار جانب سے غلے، پھل، سبزیاں، کپڑے اور ضروریاتِ زندگی کے دوسرے سامان لا کر مکہ کی منڈیوں میں فروخت کرتے تھے، جس سے مکہ میں بہ فراوانی ہر طرح کا سامان مہیا ہوتا رہا۔ تاریخ کے طویل دور میں موسم حج یا عام دنوں میں خورد ونوش یا دیگر ضروریات زندگی کی کبھی کمی نہیں ہوئی، یہ تو مادی برکتوں کا نمونہ ہے، جہاں تک تعلق ہے روحانی برکتوں کا تو اُس کا ٹھکانہ ہی کیا، حرم میں ادا کی جانے والی ایک نماز کا ثواب عام مساجد کی نماز سے ایک لاکھ گنا زائد ہوتا ہے، حج وعمرہ اور طواف جیسی عظیم عبادتیں یہیں انجام دی جاسکتی ہیں، حج کو اگر شرفِ قبولیت عطا ہو تو پھر جنت ہی اس کا ثواب اور بدلہ ہے، حج سے انسان

گناہوں سے ایسا پاک ہوتا ہے جیسے ابھی اُسے اُس کی ماں نے معصوم جنا ہو، دنیا میں کوئی اور مقام نہیں جہاں برکتوں کی ایسی ارزانی ہو۔ (معارف القرآن ۲/۱۱۳-۱۱۷)

یہ گھر چشمہ برکت ہونے کے ساتھ ساتھ مرکز رشد وہدایت بھی ہے، انسان جب یہاں کے روحانی ماحول میں پہنچتا ہے، حج وعمرہ اور طواف کی سعادتوں سے بہرہ ور ہوتا ہے، تو یہاں پر ہونے والی انوار وتجلیات کی بارش سے اس کا دل چمک اُٹھتا ہے، باطل کا زنگ، شرک وبدعات کی گندگیاں، گناہوں اور شہوتوں کی تاریکیاں دھل جاتی ہیں، اور جو نور ایمان دل میں ٹمٹماتے چراغ کے مانند تھا، پوری آب وتاب سے چمکنے لگتا ہے، اور یہی نورِ ایمان پھر انسان کو کشاں کشاں جنت کی راہ یعنی صراطِ مستقیم پر لے آتا ہے، اور انسان کو راہِ حق کی ہدایت نصیب ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةَ مبارکًا وَهُدًى لِلْعَالَمِیْنَ. (ال عمران: ٩٦، روح المعاني ٤/٥)

لوگوں کے لئے بنایا جانے والا سب سے پہلا گھر وہ ہے جو مکہ میں ہے، برکت والا اور سارے جہاں کے لوگوں کے لئے ہدایت والا ہے۔

(٦) خانۂ کعبہ ایسی زیارت گاہ ہے جہاں انسان بار بار آتا ہے:

سادی بناوٹ کی سیاہ غلاف والی اس عمارت میں اللہ تعالیٰ نے ایسی جاذبیت اور مقناطیسیت رکھ دی ہے کہ انسان بار بار اُس کی زیارت کے لئے جاتا ہے، اور پہلے سے زیادہ اشتیاق لے کر واپس ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی اس زمین میں ہزاروں اور لاکھوں دل فریب مناظر ہیں، جو اپنے قدرتی حسن کی وجہ سے زائرین کے لئے مرکز توجہ بنے ہوئے ہیں؛ مگر تمام قدرتی حسن کے باوجود انسان ایک دو بار اُن مناظر کو دیکھ کر اُکتا جاتا ہے؛ لیکن قدرتی حسن کی رعنائیوں سے خالی بے آب وگیاہ وادی میں آباد شہر مکہ اور اُس میں خانۂ کعبہ میں کچھ ایسی روحانی کشش ہے کہ آدمی اُس سے سیر نہیں ہوتا، اور بار بار زیارت کرنے سے شوقِ زیارت فزوں سے فزوں تر ہوتا جاتا ہے، اور کیوں نہ ہو؟ اللہ نے اُسے ایسا بنایا ہی ہے۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ وَاَمْنًا. (البقرة: ١٢٥)

ہم نے خانۂ کعبہ کو بار بار لوٹ کر آنے کی جگہ اور جائے امن بنایا ہے۔

''مثابۃ'' کا مشہور معنی تو وہی ہے جو اوپر گذرا، بعض مفسرین نے مثابۃ کا ترجمہ ''جائے ثواب'' سے کیا ہے، یہاں چوں کہ اعمال کا ثواب اور جگہ کی بہ نسبت بہت بڑھ جاتا ہے، اس لئے خصوصیت کے ساتھ اُسے مثابۃ یعنی جائے ثواب کہا گیا ہے۔ (روح المعانی ۱/۳۷۸)

□□□ (جاری)

نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے پانچویں قسط

صدموں اور غموں بھرے لمحات

مولانا کلیم اللہ قاسمی معتمد دارالافتاء جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد

حضرت قاسمؓ کے وصال پر حضرت سید الخلق ﷺ کو صدمہ

حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے بعد سب سے پہلے صاحب زادے حضرت قاسم رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے، اُنہیں کے نام پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کنیت ''ابوالقاسم'' رکھی، اُن کی وفات کس عمر میں ہوئی، اِس بارے میں مؤرخین کے اَقوال مختلف ہیں، مگر قولِ راجح یہی ہے کہ ابھی مدت رضاعت ختم نہیں ہوئی تھی کہ اُن کا وصال ہوگیا، تقریباً دو برس کے ہو چکے تھے، حضرت قاسم رضی اللہ عنہ کے انتقال پر حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت زیادہ غم اور صدمہ پہنچا۔

حضرت قاسم رضی اللہ عنہ کی رحلت پر حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر حزن وملال کی کیفیت طاری تھی کہ کفار ومشرکین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اَبتر کہہ کر طعنہ دینا شروع کر دیا، ایسا کہنے والوں میں عاص بن وائل کا نام خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے، اُس کے سامنے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا، تو کہتا تھا کہ اُن کی بات چھوڑ دو، یہ کچھ فکر کی بات نہیں؛ کیوں کہ وہ ابتر (مقطوع النسل) ہیں، جب اُن کا انتقال ہوجائے گا تو اُن کا کوئی نام لینے والا بھی نہ رہے گا۔ کفار ومشرکین کی ان طعنہ آمیز باتوں پر بھی غم ورنج میں اِضافہ ہوجانا طبعی امر تھا، اس لئے ایسے غم اور صدمے کے لمحات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے سورۂ کوثر نازل فرمائی، جس میں کفار ومشرکین کے ان طعنوں کا جواب دیا گیا ہے کہ صرف اولادِ نرینہ کے نہ رہنے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مقطوع النسل کہنے والے حقائق سے بے خبر ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل نسبی بھی انشاء اللہ دنیا میں تا قیامت باقی رہے گی، اگرچہ دختری اولاد سے ہو، اور نسل معنوی یعنی آپ پر ایمان لانے والے مسلمان اور صاحب ایمان وہ تو اِس کثرت سے

ہوں گے کہ پچھلے تمام انبیاء علیہم السلام کی امتوں سے بھی بڑھ جائیں گے۔ سورۂ کوثر کی آیت نمبر تین میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْاَبْتَرُ. (الکوثر: ۳) بے شک آپ کا دشمن ہی بے نام ونشان ہے۔

اِس سورت کا نزول کفار ومشرکین کے طعنوں کے دفاع میں ہوا، آپ کی اولادِ نرینہ فوت ہوجانے کی وجہ سے وہ آپ کو مقطوع النسل قرار دے کر کہا کرتے تھے کہ اُن کا کام چندروزہ ہے، پھر کوئی نام لینے والا بھی نہ رہے گا، تو اس سورت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوثر عطا فرمانے کا ذکر ہے، جس میں حوضِ کوثر بھی شامل ہے، جس میں ان طعنہ زنوں کی مکمل تردید ہے کہ اُن کی نسل ونسب صرف یہی نہیں کہ دنیا کی عمر اور بقا تک چلے گی؛ بلکہ اُن کی روحانی اولاد کا رشتہ محشر میں بھی محسوس وموجود ہوگا، جہاں وہ تعداد میں بھی تمام اُمتوں سے زیادہ ہوں گے، اور اُن کا اعزاز واکرام بھی سب سے زیادہ ہوگا۔ اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کی بات کی تردید فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ آپ غمزدہ نہ ہوں، جو لوگ آپ کو ابتر ہونے کا طعنہ دیتے ہیں وہی ابتر ہیں۔ چنانچہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو حق تعالیٰ نے کیسی رفعت اور عظمت عطا فرمائی کہ آپ کے عہد مبارک سے آج تک پوری دنیا کے چپہ چپہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک پانچ وقت اللہ کے نام کے ساتھ مساجد کے میناروں سے پکارا جاتا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر اُمتی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لینے اور آپ پر درود وسلام بھیجنے کو اپنی سعادت سمجھتا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو طعنہ دینے والوں کا نام ونشان تک مٹ گیا، آج دنیا میں اُن کا نام لینے والا کوئی نہیں ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ۔ (مستفاد: الاصابۃ ۳/۱۶۵۳، معارف القرآن ۸/۸۲۸-۸۳۱ ربانی)

حضرت ابراہیمؓ کے وصال پر صدمہ اور صبر

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کو دیکھا کہ حضور کے سامنے اُن پر نزع کی کیفیت طاری تھی، یہ منظر دیکھ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو آگئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں، اور دِل غمگین ہورہا ہے؛ لیکن ہم زبان سے وہی بات کہیں گے جس سے ہمارا رب راضی ہو، اے ابراہیم! اللہ کی قسم ہم تمہارے جانے کی وجہ سے غمگین ہیں۔ (حیاۃ الصحابہ اردو ۲/۷۳۵)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ پر سہارا لگائے ہوئے نخلہ نامی جگہ پر تشریف لائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ آپ کے صاحب زادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ ماں کی گود میں جاں کنی کی حالت میں ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اَپنی گود میں لے لیا، پھر فرمایا کہ اے ابراہیم! ہم تم سے اللہ کی طرف سے مقرر کردہ چیز کو ٹال نہیں سکتے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں، آپ نے فرمایا کہ اے ابراہیم! اگر یہ ایک امر قطعی نہ ہوتا اور سچا وعدہ نہ ہوتا کہ ہم میں کا آخر پہلے مرنے والوں کے ساتھ ملنے والا ہے، تو ہم تم پر اِس سے کہیں زیادہ غم کرتے، اور اے ابراہیم! ہم تمہاری وجہ سے یقیناً مغموم ورنجیدہ ہیں، آنکھیں اَشک بار ہیں، دل غمگین ہے؛ لیکن پھر بھی ہم ایسی بات نہیں کہہ سکتے جس سے ہمارا رب ناراض ہوجائے۔ (سنن ابی داؤد ۲/۴۴۶، اسد الغابہ ۱/۵۰)

اِسی طرح کی ایک روایت میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ پر سہارا لئے ہوئے تشریف لائے، حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ پر نزع کی حالت طاری تھی، پھر جب اُن کا انتقال ہوگیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! اِس سے تو آپ لوگوں کو روکتے ہیں، جب مسلمان آپ کو روتا ہوا دیکھیں گے تو وہ بھی رونے لگ جائیں گے، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنسو رک گئے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ رونا تو رحم یعنی دل کی نرمی کی وجہ سے ہے، جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا اُس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا، ہم تو لوگوں کو مردہ پر نوحہ کرنے سے روکتے ہیں، اور اِس بات سے روکتے ہیں کہ مردہ کی اُن خوبیوں کا تذکرہ کیا جائے جو اُس میں نہیں تھیں، اگر اللہ تعالیٰ کا سب کو اکٹھا کردینے کا وعدہ اور موت کا چالو راستہ نہ ہوتا اور ہم میں سے بعد میں جانے والوں کا پہلے جانے والوں سے جا کر ملنا نہ ہوتا، تو ہمیں اس سے زیادہ غم ہوتا، اور ہم اس کے جانے پر غمگین ہیں، آنکھ سے آنسو بہہ رہے ہیں، دل غمگین ہے؛ لیکن ہم زبان سے ایسی بات نہیں کہیں گے جس سے ہمارا رب ناراض ہو، اور اُس کے دودھ پینے کی باقی مدت جنت میں پوری کی جائے گی۔ (حیاۃ الصحابہ ۲/۵۳۵)

حضرت رقیہؓ کی بیماری اور رحلت پر آپ ﷺ کو صدمہ

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لاڈلی بیٹی ہیں، حضرت عثمان غنی رضی اللہ

عنہ کی چہیتی بیوی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیٹی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا سے بے پناہ محبت وشفقت فرماتے تھے، اکثر وبیشتر اپنی پیاری بیٹی سیدہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے جاتے تھے، اپنی بیٹی کے پاس بیٹھتے ہی ان کی خیریت دریافت فرماتے اور اپنی بیٹی کو گراں قدر نصیحتوں سے فیض پہنچاتے، حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا جب خواتین میں بیٹھتیں تو یہ درس ان تک پہنچا دیا کرتی تھیں، حقیقت یہ ہے کہ آپ کی تمام بیٹیاں بہترین عالمہ اور بلند پایہ مبلغہ تھیں۔

ایک مرتبہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے، تو دیکھا کہ وہ اپنے شوہر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا سر دھو رہی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹی کے اس جذبہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بیٹی سے شفقت کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ: ''اے میری بیٹی! ہمیشہ اپنے شوہر عثمانؓ کے ساتھ اچھا سلوک رکھنا اور حسن معاملہ کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرنا، بے شک عثمان میرے اصحاب میں سے ہیں، اور اخلاقیات میں مجھ سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے ہیں''۔ (عظمت صحابہ نمبر ۹۰۴)

غزوۂ بدر ۱۷؍رمضان المبارک ۲؍ہجری میں پیش آیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ۳۱۳؍ مجاہدین نے حق وباطل کے ساتھ پہلے معرکہ میں شرکت کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے صحابہ کے ساتھ اس غزوہ کے لئے تشریف لے جا رہے تھے، اس وقت سیدہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا علیل تھیں، بعض مؤرخین تحریر کرتے ہیں کہ موصوفہ کو خسرہ کی بیماری لاحق ہوگئی تھی، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اپنی چہیتی بیوی سے بہت محبت کرتے تھے، اور ان کی بیماری میں دن رات خدمت میں لگے ہوئے تھے، آپ ﷺ جہاد میں تشریف لے جانے سے قبل حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کو دیکھنے ان کے گھر تشریف لے گئے، بیٹی کی حالت دیکھی تو ان کی تکلیف کو دیکھ کر بے چین ہوگئے؛ لیکن فرض سامنے تھا، آپ ﷺ کو اس معرکہ میں شرکت کرنی ضروری تھی؛ کیوں کہ قریش مکہ سے مسلمانوں کا یہ پہلا معرکہ تھا، اس لئے آپ ﷺ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ میں ٹھہرنے کا حکم دیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اس لئے تمہیں اپنے ساتھ لے کر نہیں جا رہا ہوں کہ رقیہ بیمار ہیں، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے سامنے حضرت رقیہ کی بیماری اور دوسری طرف جہاد کا معرکہ تھا، آپ کا دل چاہ رہا تھا کہ اس غزوہ میں ضرور شریک ہوں؛ لیکن سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا صرف ان کی بیوی ہی نہیں، حضور اکرم ﷺ کی صاحب زادی بھی تھیں، حضرت نبی اکرم ﷺ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی یہ کیفیت دیکھی، تو فرمایا کہ عثمان! رقیہ کی تیمارداری کون کرے

گا؟ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں جہاد کی برکت اور اس کے فضل سے محروم رہ جاؤں گا، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں رقیہ کی تیمارداری کرنے کی وجہ سے بدری صحابہؓ کے برابر اجر وثواب ملے گا، حضور اکرم ﷺ کے حکم کو حضرت عثمان غنیؓ کسی صورت میں ٹال نہیں سکتے تھے، اس لئے آپ ٹھہر گئے، اور جی جان سے حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی دیکھ بھال کی، اور ساتھ میں علاج ومعالجہ بھی کرایا؛ لیکن آپ کی بیماری بڑھتی ہی گئی، کوئی افاقہ نہ ہوا۔

مؤرخین اور علماء کرام لکھتے ہیں کہ: ''حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فرمان کے ذریعہ مدینہ منورہ میں رکنے کا حکم دیا تھا اور بدر کی شمولیت سے روکا تھا، اس واقعہ اور حکم نبوی سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی تیمارداری کے لئے رکے تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو غزوۂ بدر کے مالِ غنیمت میں بدری صحابہ کے برابر حصہ عنایت فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عثمان غزوۂ بدر کے اجر وثواب میں بھی برابر کے شریک ہیں''۔ (عظمت صحابہ نمبر ۹۰۵-۹۰۶)

۱۷؍رمضان المبارک ۲؍ہجری کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری بیٹی سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا اپنے خالق حقیقی سے جاملیں، آپ کی عین عالم جوانی میں وفات واقع ہوئی، آپ کی عمر صرف ۲۳؍سال کی تھی، حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا نے دنیا کے عظیم ترین انسان سے تعلیم وتربیت حاصل کی تھی، اس لئے ہجرت حبشہ اور ہجرتِ مدینہ منورہ کے وقت آپ کا جن مصائب سے واسطہ پڑا، وہ آپ نے نہایت صبر واستقلال سے برداشت کئے، اپنی موت سے قبل آپ نے کافی دنوں تک بیماری کی تکلیف برداشت کی؛ لیکن آپ کی زبان سے اُف بھی نہیں نکلا، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے لئے عزیزہ وصابرہ رفیقۂ حیات کی وفات بہت بڑا صدمہ تھا، رنج وغم کی شدید کیفیات آپ پر طاری تھیں؛ لیکن آپ نے انتہائی صبر وتحمل سے سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کی تجہیز وتکفین کا انتظام کیا، مدینہ منورہ میں موجود صحابہ کرام نے آپ کو تسلی وتشفی دی، اور آپ کے ساتھ سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کی تدفین میں شامل ہوئے۔

بعض مؤرخین نے تحریر کیا ہے کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جب غزوۂ بدر کی فتح کی خوش خبری لے کر مدینہ منورہ میں داخل ہوئے تو اس وقت تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا

کی تدفین کا کام مکمل کر چکے تھے، اور اپنے ہاتھوں سے مٹی جھاڑ رہے تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ فتح کی خوش خبری لے کر مدینہ منورہ میں داخل ہوئے، فتح کا پرچم صحابہ کے ہاتھ میں لہرا رہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ میں داخل ہونے کے بعد اپنی عزیز از جان بیٹی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی موت کی خبر ملی۔ بعض مؤرخین نے تحریر کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بدر سے فارغ ہوکر قیدیوں کے سلسلہ میں فیصلہ فرما رہے تھے، تو آپ کو اپنی پیاری بیٹی سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کی وفات کی خبر ملی تھی۔ اس عظیم صدمہ کی وجہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم مبارک سے آنسو رواں ہوگئے، آپ نے اپنے مبارک ہاتھ سے اپنے آنسوؤں کو صاف کیا، اور اپنے گھر تشریف لے جانے کے بجائے سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کی قبر پر پہنچے، پیاری بیٹی کی قبر پر ہاتھ پھیر کر زبانِ مبارک سے فرمایا کہ: ''اے بابا کی جان تو بھی ہمیں چھوڑ کر چلی گئی، جہاں حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ گئے ہیں''۔ (حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ ایک بلند پایہ صحابی رسول تھے، ہجرتِ حبشہ میں شریک تھے، مدینہ منورہ ہجرت کرنے کے بعد یہ پہلے صحابی تھے جن کی وفات واقع ہوئی اور یہ پہلے مہاجر صحابی تھے، جنہیں جنت البقیع میں دفن ہونے کا شرف حاصل ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی وفات پر بھی آنسو جاری ہوگئے تھے)

سیدہ رقیہؓ کی وفات پر پورے مدینہ میں سوگواری

آپ کی زبان مبارک سے جب یہ جملہ ادا ہوا، تو تمام صحابہ کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی، اس موقع پر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی بھی غم والم کی وجہ سے یہ حالت تھی کہ روتے روتے ان کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی تھی، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کی موت پر پورے مدینہ پر سوگواری طاری ہوگئی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ عورتیں تیز آواز میں گریہ وزاری کر رہی ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''اگر رنج وغم کا اظہار دل اور آنسوؤں سے ہو تو کوئی حرج نہیں، زبان سے نوحہ کرنا، گالوں کو پیٹنا، سینہ کوبی کرنا، گریبان چاک کرنا اور بالوں کو کھینچنا زمانۂ جاہلیت کی رسوم اور شیطانی فعل ہیں''۔

تاریخ گواہ ہے کہ آپ نے اپنی پیاری بیٹی کی وفات پر آنسو تو بہائے؛ لیکن پیکر صبر ورضا بن کر پوری امتِ مسلمہ کو کسی بھی عزیز قریب کے انتقال پر صبر وضبط تسلیم ورضا کا دامن مضبوطی سے تھامے رہنے

کی تلقین فرمائی۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے چھوٹی صاحب زادی تھیں، سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا اُن کی بڑی بہن تھیں، سیدہ رقیہ سے بے پناہ محبت کرتی تھیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہن کی قبر پر حاضر ہوئیں۔ (واضح رہے کہ اس وقت تک خواتین کا قبرستان میں جانا ممنوع نہیں تھا) تو پیاری بہن کی قبر سے لپٹ کر زار وقطار رونے لگیں، پیارے ابا جان نے اپنی ردائے مبارک سے ان کے آنسو صاف کئے اور انہیں صبر کی تلقین فرمائی۔ (عظمتِ صحابہ نمبر ۹۰۶-۹۰۷)

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے بیٹے عبداللہ کا بچپن میں وصال

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہا کے ساتھ حبشہ میں تھیں، تو آپ کے گھر بیٹے کی ولادت ہوئی تھی، ان کا نام عبداللہ تھا، سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کے یہ بیٹے نہایت حسین وجمیل اور صحت مند تھے، یہ اتنے پرکشش تھے کہ راہ چلتے ہوئے لوگ انہیں دیکھ کر رک جاتے، پھر انہیں پیار ضرور کرتے، چھ برس کی عمر میں حضرت عبداللہ کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا، ایک مرغ نے ان کی آنکھ پر چونچ ماردی، اس وقت حضرت عبداللہ کھیل رہے تھے، ان کی آنکھ میں زخم ہوگیا، اور اس زخم کی وجہ سے چہرے پر ورم آگیا، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس چہیتے نواسہ کی صرف چھ سال کی عمر میں وفات ہوگئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی وفات پر بہت زیادہ مغموم ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نواسہ کو گود میں اٹھایا، شدتِ غم سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ اپنے بندوں کو رحمت وشفقت سے نوازتا ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نواسہ کی نماز جنازہ پڑھائی، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ قبر میں اترے اور پھر عبداللہ کی تدفین عمل میں آئی۔ (مستفاد: عظمت صحابہ نمبر ۹۰۷)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے عزیز بیٹی کی موت کا صدمہ پہنچا، پھر نواسے کی وفات کا دل دوز واقعہ پیش آیا، یہ دونوں صدمے یکے بعد دیگرے آپ نے برداشت کئے، اور پوری امت کو صبر وضبط اور رب العالمین کے فیصلوں پر راضی رہنے کا درس دیا۔

❍❖❍

دنیا میں کیا کیا ہوگا؟

مولانا مفتی محمد عفان صاحب منصور پوری صدر المدرسین واستاذِ حدیث جامعہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ

علم رخصت ہوجائے گا

پھر آپ نے ارشاد فرمایا: ''وَیُقْبَضُ الْعِلْمُ'' (علم کو اُٹھالیا جائے گا) علم کو اُٹھانے کا مطلب یہ نہیں کہ حدیث کی کتابیں ختم ہوجائیں گی یا قرآن کریم اُٹھالیا جائے گا یا دینی کتابیں ہمارے درمیان نہیں رہیں گی؛ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو علم پر عمل کرنے والے لوگ ہوں گے وہ رفتہ رفتہ اُٹھتے چلے جائیں گے، اور جو عارف باللہ، عالم دین، اللہ کا ولی دنیا سے جائے گا وہ اپنی جگہ ایسی خالی کرکے جائے گا کہ اس کا بدل نہ ہوگا۔ ارشاد نبویؐ ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لاَ یَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزاعاً یَنْتَزِعُہٗ مِنَ الْعِبَادِ وَ لٰکِنْ یَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ حَتّٰی اِذَا لَمْ یَبْقِ عَالِمًا اتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُوْسًا جُھَّالًا فَسُئِلُوْا فَأَفْتَوْا بِغَیْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوا وَ اَضَلُّوْا.

(بخاری شریف حدیث ۱۰۰ جلد ۱/ ۴۰)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ علم کو اس طرح نہیں اُٹھائے گا کہ لوگوں کے سینے سے نکال لے بلکہ علماء کو ایک ایک کرکے اُٹھاتا رہے گا یہاں تک کہ جب کوئی عالم نہ رہے گا تو لوگ جاہلوں کو پیشوا بنالیں گے، ان سے مسائل پوچھیں گے، وہ جانے بوجھے بغیر فتویٰ دیں گے، وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

اس طرح جب لوگ اُٹھتے جائیں گے تو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام ارشاد فرماتے ہیں کہ لوگ گمراہ لوگوں کو اپنا پیشوا اور رہنما بنالیں گے، انہیں سے وہ اپنے مسائل کے سلسلے میں رجوع کریں گے وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور جو ان سے رجوع کرے گا اس کو بھی گمراہ کریں گے، یہ صورت حال جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے میں ارشاد فرمائی جس زمانے میں صحابہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے لیکن آج کی صورت حال پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف صادق ہوتی دکھائی دیتی ہے اور حضور کی حقانیت اور رسالت اور نبوت پر یقین مزید پختہ ہوتا چلا جاتا ہے کہ اللہ نے اپنے نبی کو ایسی غیر معمولی صلاحیت سے مالا مال فرمایا تھا کہ آپ کے سامنے مستقبل کا نقشہ ایسا کھلا ہوا تھا

جیسے ہمارے سامنے کوئی کتاب کھلی ہوئی ہو اور اس میں دیکھ دیکھ کر ہم کوئی چیز بتا رہے ہوں۔

قتل وغارت گری عام ہوگی

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یَکْثُرُ الْھَرَجُ'' ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اس میں ہرج کی بہتات ہوگی۔ صحابہ نے پوچھا: ''مَا الْھَرَجُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ'' (اے اللہ کے رسول یہ ہرج کیا چیز ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قتل وغارت گری، ہلاکت وبربادی، لڑائی، جھگڑا، فتنہ وفساد یہ سب ہرج کا مصداق ہیں، دنیا میں ہر طرف قتل وغارت گری کا بازار گرم ہوگا، ایک فتنہ دبتا نہیں ہوگا کہ دس فتنے اس کی جگہ کھڑے ہو جائیں گے، اختلافات کا ایسا سلسلہ شروع ہو گیا ہوگا کہ جس کا سرا ملنا مشکل ہو رہا ہوگا، اور انسانیت کا قتل اتنا عام ہو گیا ہوگا کہ واردات قتل کو سن کر بھی انسان کو حیرت وتعجب نہ ہوگا، آج بالکل یہی صورت حال ہے، قتل وغارت گری ایک عام چیز ہوگئی ہے، غنڈہ گردی، لوٹ مار، بدامنی، فتنہ وفساد بالکل عام ہو گئے ہیں اور روزانہ اتنے واقعات ذرائع ابلاغ کے ذریعے سننے کو ملتے ہیں کہ آدمی ان پر بالکل توجہ نہیں دیتا کہ یہ تو روزمرہ کی چیز ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قتل وغارت گری اتنی عام ہو جائے گی کہ مارنے والے کو اتنا پتہ نہیں ہوگا کہ میں مار کیوں رہا ہوں اور جس کو قتل کیا گیا ہوگا اس کو پتہ نہیں ہوگا کہ اس کو کیوں مارا گیا؟ ''لاَ یَدْرِی الْقَاتِلُ فِیْمَ قَتَلَ وَلاَ یَدْرِیْ الْمَقْتُوْلُ فِیْمَ قُتِلَ''. (مشکوٰۃ المصابیح ٤٦٢) مارنے والا تو کرائے پر مارے گا جو اس کو پیسہ دے دے گا اور اس کو نام بتا دیا جائے گا کہ اس کو مارنا ہے، اس کا مقصد تو پیسہ کمانا ہے، میں مار کیوں رہا ہوں اس سے اس کو کوئی سروکار نہیں۔ یہی آج دنیا میں ہو رہا ہے اور جو مقتول ہے اس بیچارے کو یہ پتا نہیں کہ میں کیوں گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ بھی دنیا میں عام ہے، ایک بے گناہ انسان کو قتل کر کے گولی مار کے اس کے ہاتھ میں بندوق تھما دی جاتی ہے اور شہرت یہ کی جاتی ہے کہ یہ ہم سے مقابلے کے لیے آیا تھا حالانکہ اس کے فرشتوں کو بھی یہ علم نہ ہوگا کہ مجھے راستے میں گولی کا نشانہ بننا پڑے گا آج یہی ماحول ہے، جو حقیقی مجرم ہوتے ہیں اور قتل وغارت گری کا بازار گرم کرنے والے ہوتے ہیں ان کے ہاتھ اتنے لمبے ہوتے ہیں کہ قانون کے شکنجے سے اپنے کو بچانے کے لیے ایک بے گناہ کو مار کر اسی کے اوپر یہ سارے مقدمات چلاتے ہیں اور یہ سارے تماشا دیکھتے ہیں ان پر کوئی قانون ہاتھ رکھنے والا نہیں ہوتا، کوئی شکنجہ ان کو کسنے والا نہیں ہوتا، بے گناہ آزمائش کی بھٹی کے اندر جلتا رہتا ہے، حضور پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سینکڑوں برس پہلے ان حالات کی پیشین گوئی فرمائی۔

قرآنِ کریم پر عمل نہیں ہوگا

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ثُمَّ یَاتِیْ بَعَدَ ذٰلِکَ زَمَانٌ یَقْرَءُ الْقُرْآنَ الرَّجُلُ لَا یُجَاوِزُ تَرَاقِیَھُمْ" (فرمایا کہ ایک ایسا دور آئے گا کہ آدمی قرآن کریم پڑھے گا تو سہی لیکن قرآن اس کی ہنسلی سے نیچے نہیں اترے گا، ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا) اس کا مطلب یہی ہے کہ قرآن کی تعلیمات پر عمل نہیں ہوگا۔ انسان روحانی اعتبار سے مریض ہوتا ہے، روگ کے اندر مبتلا ہوتا ہے، روحانی مریض چاہے دیکھنے میں جتنا تندرست وتوانا ہو لیکن اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کا نافرمان ہے تو روحانی اعتبار سے اس کے دل کو روگ لگا ہوا ہے اور اس مرض کا علاج یہ ہے کہ قرآن کو پڑھا جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔ دوا اُسی کے حکم سے اثر انداز ہوتی ہے جب حلق کے راستے سے اس کو معدے میں اتارا جاتا ہے، پھر اعضاء کے اندر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں، اگر ڈاکٹر صاحب اور حکیم صاحب سے نسخے خوب اچھے اچھے لکھوا لئے جائیں اور بیٹھ کر ان کا مطالعہ کیا جائے تو کبھی ان نسخوں سے فائدہ نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم تو علاج ہے، کتابِ شفاء ہے، روحانی امراض کا خاتمہ کرنے کا سب سے بہترین ذریعہ اللہ کا کلام ہے، روحانی امراض ہی نہیں بلکہ جسمانی امراض کے لیے بھی کتاب الٰہی شفاء ہے اگر ہم اس دوا کو اپنے حلق سے نیچے نہیں اتاریں گے یعنی اس پر عمل نہیں کریں گے تو فائدہ کیسے ملے گا؟ جس طرح ڈاکٹر اور طبیب کی تجویز کردہ دوا کو استعمال کئے بغیر آدمی کو شفاء نہیں ہوتا، اسی طرح قرآن کریم کو حلق سے نیچے اتارے بغیر، اس کی تعلیمات اور ہدایات پر عمل کئے بغیر نہ کبھی کسی کو کامیابی ملی ہے اور نہ کامیابی مل سکتی ہے، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہی بات ارشاد فرمائی کہ قرآن کریم پڑھنے والے تو ہوں گے لیکن ایسے پڑھنے والے ہوں گے کہ قرآن ان کی ہنسلی اور حلق سے نیچے نہیں اترے گا یعنی تعلیمات اور ہدایات سے ان کی زندگی خالی ہوگی۔

کفار و مشرکین منہ زوری کرنے لگیں گے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "یُجَادِلُ الْمُشْرِکُ بِاللّٰہِ الْمُؤْمِنَ فِیْ مِثْلِ مَا یَقُوْلُ".
ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ مشرک مؤمن سے دعویٰ توحید کے سلسلے میں حجت بازی کرنے لگے گا۔ یعنی کافروں کے حوصلے اتنے بلند ہوجائیں گے کہ وہ باطل پر ہونے کے باوجود بدیہات کے سلسلے میں منہ شگافیاں کرنے لگیں گے، صاحب فیض القدیر علامہ مناویؒ کی تشریح کے مطابق کفار اگرچہ دلیل و حجت کے اعتبار سے

مغلوب و کمزور ہوں گے اور اہل ایمان غالب و طاقتور ہوں گے ؛ لیکن ان کو یہ جرأت ہوجائے گی کہ وہ مسلمانوں سے منھ در منھ بات کریں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث آج کے منظر نامے پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہے اور جن جن باتوں کی پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نشاندہی فرمائی ہے وہ معاشرے کے اندر بالکل عام دکھائی دیتی ہیں ان کو تلاش کرنے کی بھی ضرورت نہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دل کی بات پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بیان فرمائی اور دکھتی رگ کے اوپر انگلی رکھی ہے۔ جہاں پانی مر رہا ہے خرابی جہاں سے آرہی ہے اور جس سوراخ سے مفاسد اور بگاڑ معاشرے کے اندر آرہے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کی جانب نشاندہی فرمائی ہے، اور ان تمام احادیث کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ حضور پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارک سے ان ارشاد گرامی کو سن کر اپنے آپ کو آخرت کے لیے تیار کریں اور جن فتنوں اور برائیوں کا پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تذکرہ کیا ہے اگر خدانخواستہ اپنی زندگی میں اُن میں سے کسی کو دیکھ رہے ہیں حدیث پاک کو سنتے ہی دل سے توبہ کریں کہ آئندہ ہم اپنی زندگی میں اس برائی کو جگہ نہیں دیں گے۔ □□□

نعت:

ہر زاوئے سے اُن کا ہے کردار بے مثال

مولانا عطاء الرحمٰن عطاؔ مفتاحی جامعہ حبیبیہ پورینی بھاگلپور

میرے نبی کا پیکرِ انوار بے مثال ❖ صورت ہے بے نظیر تو کردار بے مثال
محشر میں سر بہ سجدہ ہیں اللہ کے حبیب ❖ اُمت کی مغفرت پہ ہے اِصرار بے مثال
رب کی رضا خرید لو جنت خرید لو ❖ سرکار کی گلی کا ہے بازار بے مثال
جبرئیل ساتھ دے نہ سکے پیچھے رہ گئے ❖ پروازِ مصطفیٰ کی ہے رفتار بے مثال
یونہی خدا نے اُس کو نمونہ نہیں کہا ❖ ہر زاوئے سے اُن کا ہے کردار بے مثال
سر لینے جو بھی آئے تھے دل دیکے رہ گئے ❖ اُن کے کرم کی ایسی ہے بوچھار بے مثال
غیروں کا پیٹ بھرتے ہیں خود خالی پیٹ ہیں ❖ تھا آپ کے صحابہؓ کا ایثار بے مثال
پیدا ہوا میں پہلے، بڑے تو حضور ہیں ❖ حسنِ ادب کا دیکھئے اِظہار بے مثال

سنت کے ہر عمل سے عطاؔ پیار کرکے دیکھ
پھر ہوں گے تیری نعت کے اَشعار بے مثال

اَولیاتِ صحابہؓ

انصارِ مدینہ میں

سب سے پہلے اِیمان لانے والے صحابہؓ

مولانا مفتی ابوجندل قاسمی استاذ حدیث مدرسہ قاسم العلوم تیوڑہ ضلع مظفرنگر یوپی

(۱۰) ابوالہیثم بن التیّہان رضی اللہ تعالیٰ عنہ

نام نسب:- نام مالک، کنیت ابوالہیثم، لقب ذوالسیفین، قبیلۂ اوس سے ہیں، علامہ ابن الاثیر جزریؒ اور علامہ ابن عبدالبرؒ نے نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے: ابوالہیثم مالک بن التیہان بن مالک بن عبید بن عمرو بن عبدالاعلم بن زعوراء بن جُشم بن الحارث بن الخزرج بن عمرو بن مالک بن اوس الانصاری الاوسی۔ محمد بن سعد زہریؒ نے طبقات میں اس طرح بیان کیا ہے: ابوالہیثم مالک بن التیہان بن مالک بن عمرو بن زید بن عمرو بن جُشم بن الحارث، الخ۔ اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے یوں بیان کیا ہے: ابوالہیثم مالک بن التیہان بن مالک بن عتیک بن عمرو بن عبدالاعلم بن عامر بن زعوراء، الخ۔ زعوراء بن جُشم عبدالاشہل کا بھائی تھا، جب کہ موسیٰ بن عقبہ، محمد بن اسحاق اور محمد بن عمر واقدی رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ آپ ''بلوی'' ہیں اور بلی بن عمرو بن الحاف بن قضاعہ سے ہیں، جن کے بنی عبدالاشہل سے حلیفانہ تعلقات تھے، ماں کا نام ونسب یہ ہے: یعلی بنت عتیک بن عمرو بن عبدالاعلم، الخ۔ (اسد الغابہ، ترجمہ مالک بن التیہان، الاستیعاب ۲/۱۹۷، باب مالک، الاصابہ فی تمییز الصحابہ ۷/۴۴۹، باب الکنی، ترجمہ ۲۴۵۹-۱۰۶۸۳، طبقات ابن سعد ۳/۴۱۲، طبقۃ البدریین من الانصار، سیر اعلام النبلاء ۱/۱۸۹، ترجمہ ۲۲، شاملہ)

اسلام اور بعض دیگر احوال

طبقات ابن سعد میں ہے: ''و کانَ اسعدُ بنُ زُرَارَۃَ و ابُو الْھَیْثَمِ بْنُ التَّیِّھَانِ یَتَکَلّمَانِ بِالتَّوْحِیْدِ بِیَثْرِبَ''۔ یعنی مدینہ منورہ (زادھا اللہ شرفا وعظمۃ) میں حضرت اسعد بن زرارہ اور حضرت ابو الہیثم بن التیہان رضی اللہ تعالیٰ عنہما اسلام لانے سے پہلے ہی توحید کے قائل تھے۔ (طبقات ابن سعد ۱/۱۸۵، ذکر دعاء رسول اللہ ﷺ الاوس والخزرج)

موسیٰ بن عقبہ کی روایت کے مطابق تو آپؓ ان چھ باسعادت افراد میں سے ہیں جو سب سے پہلے مشرف باسلام ہوئے، جب کہ طبقات ابن سعد میں یہ روایت منقول ہے کہ حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ

نے مدینہ منورہ آنے کے بعد اسلام کی تبلیغ شروع کی، سب سے پہلے ابوالہیثم بن التیہان سے ملاقات ہوئی، وہ بلا چون وچرا فوراً اسلام لے آئے، واللہ اعلم۔ (فتح الباری ۶۵۶/۸، کتاب مناقب الانصار، باب وفود الانصار الخ۔ طبقات ابن سعد ۱۸۶/۱)

اکثر سیرت نگار ومؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت ابوالہیثم بن التیہان رضی اللہ عنہ پہلے سال بیعت میں شریک نہیں ہوئے، بلکہ دوسرے اور تیسرے سال (یعنی بیعت عقبۂ اولیٰ اور ثانیہ میں) وہ شریک رہے ہیں۔ اور بنی عبدالاشہل کے بقول بیعت عقبۂ ثانیہ میں آپ نے ہی سب سے پہلے بیعت کے لیے ہاتھ بڑھایا، (اس سلسلے میں اختلاف کی تفصیل حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے حالات میں گزر چکی ہے) بیعت کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''نقباء'' کا انتخاب فرمایا، اور بقول سفیان بن عیینہ ویحییٰ بن کثیر حضرت ابوالہیثم بن التیہان رضی اللہ عنہ کو حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ''بنی عبدالاشہل'' کا نقیب منتخب فرمایا۔

ہجرت کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے اور حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے درمیان مواخات قائم فرمائی، آپ رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بدر واُحد وغیرہ تمام غزوات میں شرکت کی سعادت حاصل کی۔ (الاصابہ ۴۴۹/۷، باب الکنی، ترجمہ ۱۰۶۸۳، الاستیعاب ۵۷/۱، سیر اعلام النبلاء ۳۰۱/۱، شاملہ)

حضرت کلاب بن عبداللہؒ سے مروی ہے کہ: ایک مرتبہ حضرت ابوالہیثم بن التیہان رضی اللہ عنہ نے کھانا بنایا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی، ہم بھی آپ کے ساتھ تھے، جب کھانے پینے سے فارغ ہوگئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے بھائی کو بدلہ دو''، ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! کس طرح بدلہ دیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کے لیے برکت کی دعاء کرو، کیوں کہ جب کوئی شخص کسی کے یہاں کھانا کھاتا ہے اور پانی پیتا ہے اور اس کو برکت کی دعاء دیدے تو یہ اس کی طرف سے بدلہ ہے۔ (الاصابہ ترجمہ کلاب بن عبداللہ، ترجمہ ۷۵۳۱)

نبی اکرم ﷺ اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی ضیافت کا واقعہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک روز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خلافِ معمول باہر تشریف لائے، کچھ دیر کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی تشریف لے آئے، سوال ہوا: ابوبکر! کیسے آنا ہوا؟ عرض کیا: حضور کی زیارت وملاقات اور سلام وکلام کے لیے حاضر ہوا ہوں، تھوڑی دیر میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی آگئے، ان سے بھی یہی سوال ہوا کہ کیسے آئے؟ عرض کیا: یارسول اللہ! بھوک لائی ہے، ارشاد ہوا: مجھے بھی کچھ بھوک محسوس ہوتی ہے، اس کے بعد تینوں بزرگ حضرت ابوالہیثم بن

التیہان رضی اللہ عنہ کے گھر کی طرف چلے، وہ بہت کھجوروں اور بکریوں والے تھے، اوران کے پاس کوئی خادم نہ تھا، تمام کام خود ہی انجام دیتے تھے، اس وقت وہ گھر میں موجود نہ تھے، اہلیہ سے پوچھا، انہوں نے بتایا کہ میٹھا پانی لانے کے لیے گئے ہیں، تھوڑی ہی دیر میں حضرت ابوالہیثم رضی اللہ عنہ آ گئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر مشک رکھ دی اور آپ سے لپٹ کر نہایت خوشی سے کہنے لگے کہ: ''میرے ماں باپ آپ پر قربان''، اس کے بعد اپنے باغ میں لے گئے، فرش بچھایا، اور کھجوروں کی ایک شاخ کاٹ لائے جس میں کچی پکی ہر قسم کی کھجوریں تھیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چن کر پکی کھجوریں کیوں نہیں لائے، عرض کیا یارسول اللہ! میں نے چاہا کہ آپ حضرات خود انتخاب فرمائیں، یعنی جس کو جیسی پسند ہو کھائے، اس کے بعد پانی پلایا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس اللہ کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے یہ وہ نعمتیں ہیں جن کے بارے میں تم سے قیامت کے دن سوال ہوگا، ٹھنڈا سایہ، عمدہ پکی ہوئی کھجوریں اور ٹھنڈا پانی''، (یہ سورۂ تکاثر کی آیت ''ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْم'' کی طرف اشارہ ہے)

پھر ابوالہیثم رضی اللہ عنہ کھانا تیار کرنے کے لیے چلے گئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دودھ دینے والا جانور ذبح نہ کرنا، انہوں نے ایک بکری کا بچہ ذبح کیا اور اس کو بھون کر ان کے پاس لے کر آئے، کھانے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تمہارے پاس کوئی خادم نہیں؟ عرض کیا: نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب ہمارے پاس قیدی آئیں تو آنا، اسی دوران دو قیدی آئے، تو حضرت ابوالہیثم رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان میں سے ایک کا انتخاب کرلو، انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی (ﷺ)! آپ ہی میرے لیے انتخاب فرمائیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اِنّ الْمُسْتَشَارَ مُؤْتَمَنٌ''، جس سے مشورہ لیا جاتا ہے اس پر بھروسہ کیا جاتا ہے، (پس اس کو صحیح مشورہ دینا چاہیے) یہ غلام لے لو، اس لیے کہ میں نے اس کو نماز پڑھتے دیکھا ہے، اور اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا۔

حضرت ابوالہیثم رضی اللہ عنہ غلام لے کر گھر آئے، اور بیوی سے یہ بات نقل کی، بیوی بھی نہایت سمجھ دار تھیں پھر آخر صحابیہ تھیں، بولیں کہ اگر فرمانِ نبوی کی تعمیل کرنی ہے تو اس کے بغیر ممکن نہیں کہ آپ اس کو آزاد کردیں، حضرت ابوالہیثم رضی اللہ عنہ نے اس غلام کو آزاد کردیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو نہایت مسرور ہوئے، اور فرمایا: اللہ نے نہ کوئی نبی بھیجا ہے نہ اس کا نائب مگر اس کے دو راز دار ہوتے ہیں، ایک اس کو بھلائی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے، اور دوسرا اس کو بس تباہ کر کے ہی چھوڑتا ہے، اور جو شخص برے راز دار

سے بچالیا گیا تو وہ محفوظ ہوگیا۔ (ترمذی شریف ۲/۶۱، حدیث ۲۳۶۲، ابواب الزہد، باب ماجاء فی معیشۃ اصحاب النبی ﷺ)

وفات :- حضرت ابوالہیثم بن التیہان رضی اللہ عنہ نے ۲۰ھ یا ۲۱ھ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں انتقال فرمایا، بعض لوگوں کا قول ہے کہ جنگِ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہے، اور اسی میں ۳۷ھ میں شہید ہوئے، بعض حضرات نے کہا ہے کہ جنگ صفین کے کچھ وقت کے بعد شہید ہوئے، مگر پہلی روایت ہی صحیح ہے، ابونعیم اصفہانیؒ نے دوسری روایت کو غیر صحیح قرار دیا ہے، واللہ اعلم۔ (معرفۃ الصحابہ ص ۲۴۴۷، باب من اسمہ مالک۔ الاستیعاب ۲/۱۹۸) رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ

(۱۱) حضرت عُویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ

نام: عُویم، کنیت: ابوعبدالرحمٰن، نسب نامہ یہ ہے: عویم بن ساعدہ بن عائش بن قیس بن نعمان بن زید بن امیہ بن زید بن مالک بن عوف بن عمرو بن عوف بن مالک بن اوس۔ ماں کا نام ونسب یہ ہے: عُمیرہ بنت سالم بن سلمہ بن امیہ بن زید بن مالک بن عوف بن عمرو بن عوف۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ حضرت عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ ''بنوزید بن امیہ'' میں سے ہیں، بعض نے کہا کہ ''بنوعمرو بن عوف'' میں سے ہیں، اور بعض نے کہا کہ بنوعمرو بن عوف کے حلیف ہیں۔ (الاستیعاب ۲/۱۳۴، ترجمہ ۲۰۶۳۔ معرفۃ الصحابہ ص ۲۱۱۶۔ طبقات ابن سعد ۳/۴۲۵)

بعض حالات

- محمد بن عمر وواقدی نے کہا ہے کہ حضرت عویم رضی اللہ عنہ بیعت عقبۂ اولیٰ وثانیہ دونوں میں شریک ہوئے، بعض نے کہا ہے کہ صرف بیعت عقبۂ ثانیہ میں شریک ہوئے۔
- ہجرت کے بعد محمد بن اسحاقؒ کے نزدیک حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مواخات قائم ہوئی، بعض حضرات کے نزدیک حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ساتھ مواخات ہوئی۔
- آپ غزوۂ بدر واُحد اور دیگر تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ (الاستیعاب ۲/۱۳۴، معرفۃ الصحابہ ص ۲۱۱۶، طبقات ابن سعد ۳/۴۲۵، الاصابہ ترجمہ ۶۱۱۶)
- ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت میں نمایاں حصہ لیا، چناں چہ صحیح بخاری میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی زبانی منقول ہے کہ جب ہم لوگ انصار کے اجتماع کی خبر سن کر سقیفۂ بنی ساعدہ کی طرف چلے تو راستے میں انصار کے دو صالح آدمیوں سے ملاقات ہوئی، انہوں نے انصار کے اتفاقِ رائے کا تذکرہ کیا، اور پوچھا کہاں کا ارادہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ سقیفہ بنوساعدہ کا، ان دونوں حضرات

نے کہا کہ: ''لَا عَلَیْکُمْ اَلَّا تَقْرَبُوْھُمْ اِقْضُوا اَمْرَکُمْ''، یعنی وہاں جانے کی ضرورت نہیں، آپ لوگ اپنا کام کرلیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''ہم ضرور جائیں گے''۔ (صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب ۳۱ حدیث ۶۸۳۰، صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب رجم الثیب فی الزنا، حدیث ۱۶۹۱)

❍ حضرت عروہ بن زبیرؒ نے فرمایا کہ یہ دونوں صالح آدمی حضرت عویم بن ساعدہ اور حضرت معن بن عدی رضی اللہ عنہما تھے۔ (فتح الباری ۸/۳۵۴، حدیث: ۳۶۶۷، ۱۵/۶۵۵، حدیث ۶۸۳۰)

اس روایت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ دونوں بزرگ انصار کے اجتماع سے متفق نہیں تھے، اسی وجہ سے وہ مجمع سے الگ تھے۔

❍ آپؓ طہارت ونظافت کا بہت زیادہ اہتمام کرتے تھے، آپ مسلمانوں میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے استنجاء میں پانی استعمال کیا، اس کے بعد دوسرے حضرات نے بھی اس پر عمل کیا، اور پھر انہی لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿فِیْہِ رِجَالٌ یُحِبُّوْنَ اَنْ یَتَطَھَّرُوْا وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُطَّھِّرِیْنَ﴾ [التوبۃ: ۱۰۸] یعنی اہل قبا میں چند لوگ ایسے ہیں جو خوب پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب پاک رہنے والوں سے محبت فرماتے ہیں۔

❍ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مرتبہ کسی نے پوچھا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کی تعریف فرمائی ہے وہ کون ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نِعْمَ الْمَرْءُ مِنْھُمْ عُوَیْمُ بْنُ ساعِدَۃَ''۔ انہی میں ایک اچھے آدمی عویم بن ساعدہ ہیں۔ (فتح الباری ۱۵/۶۵۵، کتاب الحدود باب ۳۱، حدیث ۶۸۳۰، طبقات ابن سعد ۳/۴۲۵، الاصابہ ترجمہ ۶۱۱۶، سیر اعلام النبلاء ۱/۵۰۳)

❍ آپؓ کے تین لڑکے ہوئے، عتبہ، سُوید، قرظہ۔ (طبقات ابن سعد ۳/۴۲۵)

❍ آپؓ سے صرف ایک حدیث شریف مروی ہے، جس کو شرحبیل بن سعد اور سالم بن عتبہ نے روایت کی ہے۔ (سیر الصحابہ ۳/۱۱۱)

وفات:- ایک قول کے مطابق حضرت عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں ہی انتقال کیا، دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ۶۵ یا ۶۶ سال کی عمر میں انتقال فرمایا، اور یہی قول زیادہ صحیح ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جنازے کے ساتھ تھے فرمایا کہ ''عویم بہترین آدمی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بھی کوئی نشان کھڑا کیا عویم ہمیشہ اس کے سایے میں رہے''۔ (الاستیعاب ۲/۱۳۴، ترجمہ ۲۰۶۳، معرفۃ الصحابہ ص ۲۱۱۶) رضی اللہ عنہ وارضاہ ❍❖❍

دینی تعلیم کی قدر کریں!

مولانا محمد حذیفہ ہردے پوری، مدرس مدرسہ قاسم العلوم تیورہ مظفرنگر یوپی

آخر ہماری اس دینی تعلیم میں کمی کیا ہے؟ یہ میرا سوال ہر اس طالب علم سے ہے جو دینی علوم کو اپنے سینے میں محفوظ کر کے اور اپنے اوپر فاضل فلاں فاضل فلاں حتی کہ فاضل دارالعلوم دیوبند کا حسین لیبل لگا کر اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں عموماً اپنی آخرت یہاں تک کہ کچھ اپنی دنیا تک کو برباد کرنے والوں سے متأثر ہوتے ہیں اور اپنی زندگی کے قیمتی ۲۰/۲۵ سال ایک انمول تعلیم میں گزارنے کے بعد اس سلسلے کو منقطع کر کے چند سکوں کی خاطر اپنی آخرت داؤ پر لگا دیتے ہیں۔

اِسی طرح کا ایک واقعہ احقر کے ساتھ بھی پیش آیا جس کو عبرت کے طور پر قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ یہ قصہ جو میں لکھنے جا رہا ہوں بالکل حقیقی ہے صرف ناموں کی تبدیلی کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

یہ واقعہ زید اور خالد کے اردگرد گھومتا ہے۔ زید مادر علمی دارالعلوم دیوبند میں تکمیل افتا کا طالب علم ہے۔ جبکہ خالد اپنے علمی سفر کو مکمل کر کے ایک دوسری زندگی میں قدم رکھنے کی تگ ودو میں لگا ہوا ہے۔ خالد اپنے تعلیمی سفر کے دوران ایک بہت ہی سنجیدہ طالب علم تھا۔ گھنٹوں کی پابندی اسباق میں حاضری اس کی طبیعت ثانیہ تھی بزرگوں کی صحبت اور اساتذہ کی خدمت اس کا اہم مشغلہ تھا دعوت وتبلیغ سے بھی خاص دلچسپی رکھتا تھا اور عموماً مدرسے کی ششماہی یا سالانہ چھٹی کے اوقات جماعت میں ہی گذارتا تھا۔ دونوں کبھی ایک مدرسے کے ساتھی رہے تھے۔ زید چھٹیوں میں اپنے گھر گیا ہوا تھا اور خالد بھی اسی گاؤں میں اپنے کسی عزیز سے ملاقات کے لیے آیا ہوا تھا یوں دونوں کی ملاقات عشا کی نماز کے بعد مسجد میں ہوئی سلام ومصافحے کے بعد زید نے اس کا مشغلہ معلوم کیا تو خالد نے گویا سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بات کا رخ دوسری طرف موڑ دیا؛ لیکن باتوں باتوں میں معلوم ہو ہی گیا کہ ابھی کوئی مشغلہ نہیں ہے۔ یہ ملاقات تقریباً ایک گھنٹے تک چلی اس دوران جو باتیں ہوئیں زید کو اس جیسے شخص سے ہرگز ایسی باتوں کی توقع نہ تھی زید محو حیرت تھا کہ اس جیسا سنجیدہ، بزرگوں اور اساتذہ کی خدمت میں رہنے والا شخص ایسی باتیں کیسے کر سکتا ہے۔

خالد یوں گویا ہوا کہ بھائی زید ہمارے مدرسوں اور ہمارے اساتذہ نے ہمارے لیے کچھ نہیں کیا اور ہم کو زندگی کے اہم موڑ پے تنہا چھوڑ دیا یونیورسٹی وغیرہ میں ٹیچرس اپنے اسٹوڈینٹس کو یونہی بے یارومددگار نہیں چھوڑتے ؛ بل کہ فراغت کے بعد کوئی مناسب جاب ان کو فراہم کراتے ہیں اسی طرح یونیورسٹی اور کالج سے بڑی بڑی کمپنیاں منسلک رہتی ہیں اور ان میں جو ہونہار طلبہ ہوتے ہیں خود یونیورسٹی ان کو ان کے لائق کمپنی سے جوڑتی ہے اس طرح اسکول اور کالج میں پڑھنے والے طلبہ کو اپنے مستقبل کی کوئی فکر نہیں ہوتی ؛ بل کہ خود یونیورسٹی ان کے لیے فکرمند ہوتی ہے ؛ لیکن ہمارے مدرسے اپنے فارغین کو ایسی کوئی سہولت مہیا نہیں کراتے ہیں اور ان کے مستقبل کو یکسر نظرانداز کردیتے ہیں ہمارے اساتذہ اور ہمارے بڑے بھی اس سلسلے میں کوئی اقدام نہیں کرتے ۔اس کے بعد دارالعلوم دیوبند کو گویا ایک مفید مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ دارالعلوم کو اپنے ماتحت مدارس قائم کرنے چاہئیں اور اپنے ہر قسم کے فارغین کو مناسب جگہ مہیا کرانی چاہئے اگر کوئی دورہ حدیث سے فارغ ہو تو اس کے مناسب اور اگر کوئی تکمیل افتا یا دیگر تکمیلات سے فارغ ہو تو اس کے لائق جگہ اس کے لیے فراہم کرانی چاہیے۔آگے زید کو خاص طور پر مخاطب بناتے ہوئے کہتا ہے کہ بھائی زید! آپ کو میری بات بری معلوم ہورہی ہوگی ؛ لیکن جب آپ مدرسے سے باہر کی زندگی میں قدم رکھیں گے تو اندازہ ہوگا کہ میری باتیں سو فیصد صحیح ہیں اور تم بھی یہی کہنے پر مجبور ہوگے۔اب تم تکمیل افتا کے طالب علم ہو اس سال فارغ ہوجاؤ گے تو تم کو دارالعلوم تمہارے حال پر چھوڑ دے گا جو کرنا چاہتے ہو کرو حالانکہ اپنی تعلیم کے اعتبار سے بڑی کہی جانے والی تکمیلات افتا، تدریب فی الافتا اور تخصص فی الحدیث سے فارغ ہونے والے طلبہ کے لیے تو خود دارالعلوم کو انتظام کرنا ہی چاہیے۔ موصوف کی تنقیدی بوچھار صرف دارالعلوم یا دیگر مدارس اور ان میں پڑھانے والے اساتذہ کے دامنوں کو ہی داغدار نہیں کررہی تھی ؛ بل کہ موصوف کی تنقید کا رخ اب ہندوستان میں مسلمانوں کی سب سے بڑی اور فعال مذہبی، ملی اور سماجی تحریک جمعیۃ علماء ہند کی طرف ہونے لگا اور اس کے بارے میں بھی جو کچھ ان کے منہ میں آیا کہتے چلے گئے، ایسی ایسی باتیں کہیں جن کو لکھنے سے میرا قلم قاصر ہے۔

زید بھی اس کی باتوں کو غور سے سن رہا تھا اور اس کے ہر ہر جملے پر غور کررہا تھا کبھی اس کی سابقہ زندگی کی طرف نظر دوڑاتا تو کبھی اس کی زبان سے زہر بن کر نکل رہے جملوں پر غور کرتا ؛ لیکن بس سنتا ہی رہا اس کی کسی بات کی تردید یا تائید نہیں کی، چوں کہ زید ناتجربے کار تھا اور موصوف - زید کی نگاہ میں - عمر کے

ساتھ ساتھ تجربہ بھی رکھتے تھے۔ زید گھر جا کر اس کے ایک ایک جملے پر غور کرتا رہا اور دیر تک اس کے دماغ میں اس کی گفتگو، اس کا طرز تکلم اور اس کے زہریلے جملے گردش کرتے رہے بعد میں معلومات کرنے پر پتہ چلا کہ دراصل بات یہ ہے کہ خالد کی اپنی تعلیمی صلاحیت بہت اعلی درجے کی نہیں تھی، بزرگوں سے تعلق تقریباً ختم ہو چکا تھا اور ہر ممکن کوشش کے باوجود کوئی خاطر خواہ جگہ مل نہ سکی اور اپنے کسی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے والے عزیز کے پاس رہا جو اس کی حالت کا بخوبی فائدہ اٹھاتے ہوئے گاہے گاہے اپنی باتوں سے متأثر کرتا رہا اور یہ بھی چونکہ پریشانی کے عالم میں تھا اس لیے اس کی باتیں اس کے دل میں گھر کرتی چلی گئیں اور یہ ان سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

آخر ہم اپنی بیش بہا اور قیمتی تعلیم کے باوجود ایسے لوگوں سے کیوں متأثر ہوتے ہیں؟ اس پر تبصرہ کرنے سے پہلے مناسب سمجھتا ہوں کہ زید سے ہوئی خالد کی باتوں کا ایک تحقیقی جائزہ لیا جائے اور حقیقت کو واضح کیا جائے؛ تاکہ خالد جیسے ذہن والے لوگ کسی کے بہکاوے میں آکر مدارس اور علما کو تنقید کا نشانہ نہ بنائیں۔

میرا جہاں تک خیال ہے خالد کی یہ گفتگو اور پریشانی ذریعہ معاش کو لے کر تھی تو اس کی وضاحت کرتے ہوئے آگے قدم رکھتا ہوں خالد بھی اچھی طرح واقف ہے اور ہر مسلمان بخوبی جانتا ہے کہ رزق اور روزی کی ذمے داری خود خالق کائنات نے لی ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: ”اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُوُ الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ“ اس لئے اس حوالے سے جو کج فہم لوگ غلط فہمی اور پریشانی میں مبتلا ہوتے ہیں ان کو اپنی اصلاح اور اس غلط فہمی کو دور کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر ہم یونیورسٹی میں پڑھتے تو پچاس ہزار روپئے کما لیتے نہیں ہرگز نہیں؛ بل کہ روزی جتنی مقدر میں ہے مل کر رہے گی خواہ بالکل بھی تعلیم حاصل نہ کی ہو اور اس حقیقت سے کوئی عقل مند انکار نہیں کرسکتا۔

پھر خالد نے جو یہ کہا کہ ٹیچرس اپنے اسٹوڈینٹس کا خیال کرتے ہیں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کتنے ٹیچرس ایسا کرتے ہیں؟ چند گنے چنے ایسے ٹیچرس ہوں گے جو آپ کے دعوے کے مطابق ایسا کرتے ہوں گے ورنہ اکثر تو ایسے ہوتے ہیں کہ اپنے متعینہ وقت میں صحیح طریقے سے لیکچر بھی نہیں دیتے اور پھر اگر آپ اس مضمون میں پاس ہونا چاہتے ہیں تو آپ کو اسی ٹیچر کے پاس دوسرے وقت میں مستقل فیس ادا کرکے ٹیوشن پڑھنا پڑے گا۔ میرا ایک عزیز روزانہ ایک قریب شہر میں ٹیوشن پڑھنے جاتا، جب کہ وہ بارہویں جماعت کا طالب علم تھا میں نے اس سے پوچھا کہ آخر تم ٹیوشن میں کیا پڑھتے ہو؟ تو اس کا جواب

سن کر میں انگشت بدنداں رہ گیا۔اس نے جواب دیا کہ ہمارے ٹیچر گھنٹے میں مکمل طریقے سے نہیں سمجھاتے اوراس کتاب یا مضمون کو سمجھنے کے لیے اوراس میں پاس ہونے کے لیے الگ سے ٹیوشن پڑھنا پڑتا ہے۔

یہ ہے اس کی اصل حقیقت جس کو لے کر خالد صاحب ہمارے مدارس کے ان اساتذہ پر اعتراض کررہے ہیں، جو ہر وقت طلبہ کی خدمت کے لئے تیار رہتے ہیں اور مجال ہے کہ کسی طالب علم سے متعلقہ یا غیر متعلقہ کتاب کو سمجھانے کے لئے کسی معمولی رقم کا بھی مطالبہ کرتے ہوں۔

دوسری بات کی حقیقت کہ یونیورسٹی اپنے طلبہ کو جاب فراہم کراتی ہے اور یونیورسٹی کے پاس کمپنیوں کے آفر ہوتے ہیں۔میرا سوال یہ ہے کہ ایسی کتنی یونیورسٹی ہوتی ہیں؟ اور کتنی یونیورسٹیاں کے پاس کمپنیوں کے آفر ہوتے ہیں؟ ایسا ہر یونیورسٹی نہیں کرتی؛ بل کہ صرف بڑی یونیورسٹیوں اپنے چند ہونہار طلبہ؛ بل کہ چند موٹی رشوت دینے والے طلبہ کے لیے ایسا کرتی ہیں اور انہی بڑی یونیورسٹی کے پاس کمپنیوں کے آفر بھی ہوتے ہیں۔اوران یونیورسٹیوں میں داخلے محدود ہوتے ہیں اوراس کے بعد اگر آپ داخلہ لینا چاہتے ہیں تو اب آپ کو ایک حرام چیز کا سہارا لینا پڑے گا اور وہ ہے رشوت اور رشوت بھی تھوڑی بہت نہیں؛ بل کہ اتنی کہ ایک عام آدمی کے بس سے باہر ہو۔اس موقعے پر اپنے ایک رشتے دار کا واقعہ یاد آرہا ہے کہ میرے ایک قریبی رشتے دار کے ایک بچے کا ملک کی ایک عظیم اور بڑی یونیورسٹی میں چھٹی کلاس میں داخلہ نہ ہوسکا، توانہوں نے اس کے مذکورہ جماعت میں داخلے کے لئے سوا لاکھ روپئے بطور رشوت ادا کئے۔ذرا غور کریں کہ یہ چھٹی کلاس میں داخلے کی رشوت ہے۔

اب اگر ان یونیورسٹیوں میں پڑھ کر اچھی جاب حاصل کرنا چاہتے ہو تو پہلے اتنی بھاری رقم کا رشوت کے لیے بندوبست کرو اور رشوت دینے سے پہلے نبی کریمؐ کا یہ ارشاد بھی پیش نظر رکھا جائے ''اَلـرَّاشِـيُ وَالْـمُرْتَشِيُ كِلَاهُمَا فِي النَّارِ'' کہ رشوت دینے والا اور جس کو رشوت دی گئی دونوں جہنم میں ہوں گے۔اللھم احفظنا منہ

میں اس بات کا انکار نہیں کرتا کہ بعض صورتوں میں فقہا نے رشوت دینے کی اجازت دی ہے؛ لیکن ذرا حدیث کے ظاہر پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس فانی زندگی میں ایک جاب کو حاصل کرنے کے لیے آپ اپنی آخرت کی ابدی زندگی کی قربانی دے رہے ہیں۔

اور اگر آپ ان یونیورسٹیوں کے علاوہ کسی اور یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کریں تو یا تو مذکورہ فائدہ

حاصل نہیں ہوگا یا چوں کہ وہ پرائیویٹ ہوں گی اس لیے ان کا خرچہ اتنا ہوگا کہ وہ ایک عام آدمی کی قدرت سے باہر ہوگا۔

غرضیکہ یہ بات اتنی آسان نہیں ہے جتنی کہ خالد نے سمجھی اور اس کے نتیجے میں ان مدارس پر اعتراض کرنے لگے جو مفت پڑھاتے ہیں مفت کھلاتے ہیں اور مفت رہائش کا بھی انتظام کرتے ہیں۔

تیسری بات کہ دارالعلوم کو اپنے ماتحت اپنے فارغین کا انتظام کرنے کے لیے مدارس قائم کرنے چاہئیں اس کا جواب دینے کے لیے ایک واقعہ نقل کرتا ہوں۔

ایک جدید تعلیم یافتہ، آزاد خیال اور یونیورسٹی سے حد درجہ متأثر شخص مدرسے کے چند ذمے داران کو مشورہ دیتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ مدارس کو اپنے فارغین کا نظم کرنا چاہئے، ہر سال ہزاروں کی تعداد میں علماء فارغ ہوتے ہیں وہ کہاں جائیں گے؟ اس لئے اُن کی ملازمت کا نظم کرنا چاہئے اور دارالعلوم اپنے ماتحت مدارس قائم کرکے ان میں فارغین کو استاذ متعین کر دینا چاہئے؛ تاکہ بے چارے یہ طلبہ اِدھر اُدھر پریشان نہ پھریں۔

اِسی مجلس میں میرے والد محترم (حضرت مولانا محمد اسود صاحب مدظلہ العالی استاذ جامعہ عربیہ نافع العلوم کورانہ) بھی تشریف رکھتے تھے، اُنہوں نے ایک ایسا مسکت جواب دیا جو ایسے تمام لوگوں کو سوچنے پر ضرور مجبور کرے گا، فرمایا کہ جناب گستاخی کی معافی چاہتا ہوں، اس چیز کی مدارس کو نہیں؛ بل کہ یونیورسٹی کو ضرورت ہے، وجہ یہ ہے کہ آپ نے کسی عالم کے بارے میں یہ نہیں سنا ہوگا کہ اس نے معاش سے تنگ آکر خودکشی کرلی ہو، جبکہ شاید ہی ایسا کوئی دن ہوتا ہو جس دن یہ خبر اخبار کی زینت نہ بنتی ہو کہ فلاں ڈاکٹر یا انجینئر نے نوکری نہ ملنے کی بنا پر خودکشی کرلی؛ اس لئے اس نظم کی ہم کو نہیں؛ بلکہ یونیورسٹی والوں کو ضرورت ہے۔

اور موصوف نے جو جمعیۃ علماء پر تنقید کی اس کے بارے میں صرف یہ عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کی خدمات اتنی روشن ہیں کہ اس پر تنقید سورج پر تھوکنے کے مترادف ہے۔

محترم حضرات! اب آیئے ذرا سر جوڑ کر بیٹھئے اور اپنی تعلیم پر غور کیجئے کہ ہماری تعلیم کیا ہے ہمارے سینے میں وہ قرآن محفوظ ہے جس کا بوجھ پہاڑ تک برداشت نہ کرسکے جس کے حفاظ کی فضیلت کے بارے میں بے شمار احادیث وارد ہوئی ہیں۔

ہم نے وہ زندگی گزاری ہے جس میں ہمیں مہمان رسولؐ ہونے کا شرف حاصل تھا ہمارے پیروں

کے نیچے فرشتے بھی اپنے پر بچھاتے تھے دنیا کی ہر چیز حتی کہ مچھلی اور چیونٹی بھی ہمارے لیے بارگاہ ایزدی میں ہاتھ پھیلائے رہتی تھیں۔

ہم نے وہ تعلیم حاصل کی ہے جس کا حاصل کرنا بھی عبادت، جس کا پڑھانا بھی عبادت، جس کے لیے سفر کرنا بھی عبادت، جس کی تبلیغ کرنا بھی عبادت اور اگر اس کو حاصل کرتے ہوئے موت آجائے تو اس کے مقام کے بارے میں ارشاد نبویؐ ہے کہ ''بَیْنَہٗ وَبَیْنَ النَّبِیِّیْنَ دَرَجَۃً وَاحِدَۃً فِیْ الْجَنَّۃِ'' نیز جس کے علما کو انبیاء علیہم السلام کے وارث ہونے کا شرف حاصل ہے۔

اور ہم ایسے لوگوں سے متأثر ہوتے ہیں جن کو پیشاب پاخانہ کرنے کی تمیز نہیں، کھانا کھانے کی تمیز نہیں، پاکی اور ناپاکی میں امتیاز نہیں کرتے، ماں باپ کے حقوق سے ناآشنا، رشتے داروں کے حقوق سے ناواقف، پڑوسیوں اور بڑوں کے حقوق سے نابلد، اپنے آپ کو اسلامی تہذیب سے دور رکھنے والے اور اپنے خام خیال کے مطابق اپنے آپ کو جدید خیال سے آراستہ اور مہذب کہنے والے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنا برا ہے نہیں ہرگز نہیں؛ بل کہ جس طرح دنیا کو ایک عالم دین، مفتی اور مولوی کی ضرورت ہے اسی طرح اس سماج کو ایک ڈاکٹر انجینئر کی بھی ضرورت ہے؛ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ خدارا ہمارے مدارس اور ہمارے علما کو تنقید کا نشانہ نہ بنایا جائے اور اسلامی تہذیب، اسلامی ثقافت کو پس پشت نہ ڈالا جائے۔ اور اگر دینی تعلیم حاصل کر کے اس دنیا میں قدم رکھنا چاہتے ہیں تو شوق سے رکھیں؛ لیکن اپنی مادر ہائے علمی کی تعظیم کریں ان پر اعتراضات کی بوچھار نہ کریں، اپنی سابقہ تعلیم وتربیت کو نہ چھوڑیں، اپنی صورت اور اپنے لباس کو نہ بدلیں؛ بل کہ اس کو باقی رکھ کر جو حاصل کرنا چاہتے ہیں کریں جو اتنا وقت اپنی آخرت بنانے میں لگایا تھا اب محض دنیا کی خاطر اس کو ضائع کر کے اپنی آخرت کو برباد نہ کریں۔

اخیر میں وضاحت کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے دل کو تکلیف پہنچانا یا کسی پر تنقید کرنا یا کسی کی تنقیص کرنا ہرگز میرا مقصد نہیں ہے؛ لیکن اگر اس کے باوجود کسی کو نادانستہ تکلیف پہنچی ہو تو میں تہہ دل سے معذرت خواہ ہوں، امید ہے معذرت قبول کی جائے گی۔

اخیر اخیر میں بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہوں کہ یا اللہ! خاص طور پر مجھ کو اور عموماً پوری امت مسلمہ کو دین کی صحیح سمجھ عطا فرما۔ آمین۔

○❖○

کتاب المسائل:

مفتی محمد سلمان منصور پوری

کنایہ کے الفاظ سے طلاق کے مسائل

طلاقِ کنائی

صریح (وہ الفاظ جو صراحۃً طلاق پر دال ہوں) کے بالمقابل ''کنایہ'' کے الفاظ آتے ہیں، کنایہ کے معنی لغت میں پوشیدگی یا غیر واضح ہونے کے ہیں، اور اصطلاحاً طلاقِ کنائی کا مطلب یہ ہے کہ ایسے الفاظ سے طلاق دی جائے جو طلاق کے لئے موضوع یا معروف نہ ہوں؛ بلکہ اُن سے طلاق بھی مراد لی جاسکتی ہو، اور طلاق کے علاوہ دوسرے معنی بھی مراد لئے جاسکتے ہوں۔

جیسے کوئی شخص بیوی سے کہے کہ ''تو مجھ سے دور ہوجا''، تو اِس سے طلاق بھی مراد ہوسکتی ہے اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ اَب تو مجھ سے الگ تھلگ رہ، میں تیری کوئی خیر خبر نہ لوں گا، تو ایسی صورت میں شوہر کی نیت یا قرائن کو دیکھ کر طلاق یا عدمِ طلاق کا فیصلہ کیا جائے گا۔

كنايته عند الفقهاء ما لم يوضع لهٗ أي الطلاق، واحتمله وغيره. (الدر المختار مع الشامي ٥٢٦/٤ زكريا) **الكنايات ما خفي المراد منه، لتوارد الاحتمالات، لا تطلق بها إلا بنية، أو دلالة الحال.** (حاشية الشلبي على تبيين الحقائق ٧٥/٣ بيروت) **الكنايات لا يقع بها الطلاق إلا بالنية أو بدلالة الحال؛ لأنها غير موضوعة للطلاق؛ بل تحتمله وغيره فلا بد من التعيين أو دلالته.** (هداية ٣٥٩/٢) (**الكناية**) **وهو مصدر كنا يكنُو: إذا ستر.** (شامي ٥٢٦/٤ زكريا)

اَلفاظِ کنایہ سے وقوعِ طلاق کے بارے میں بنیادی اُصول

حضراتِ فقہاء نے لکھا ہے کہ کنایہ کے طور پر جن الفاظ سے طلاق دی جاتی ہے وہ تین قسموں پر مشتمل ہیں:

(۱) وہ الفاظ جن میں طلاق کے معنی کا بھی احتمال ہے، اور طلاق کے مطالبہ کو مسترد کرنے کا بھی احتمال ہے، مثلاً: بیوی سے کہا کہ: ''تو گھر سے نکل جا، تو یہاں سے چلی جا، تو اُٹھ کھڑی ہو، تو میرے سامنے سے ہٹ جا، تو پردہ کرلے'' وغیرہ۔ تو اِن الفاظ میں اگر شوہر طلاق کی نیت کرے تو وہ بھی مراد ہوسکتی ہے، اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ شوہر محض دفع الوقتی کے لئے اُس کو اپنے سامنے سے ہٹانے کا حکم دے رہا ہے۔

(۲) وہ الفاظ جن میں طلاق کے ساتھ ساتھ طعن وتشنیع کے معنی مراد لئے جاسکتے ہیں، مثلاً بیوی سے کہا کہ: ''تو بالکل کھوکھلی ہے، یا تو الگ تھلگ ہے، یا تو کسی کام کی نہیں'' وغیرہ۔ تو اِن الفاظ میں طلاق بھی مراد ہوسکتی ہے، اور بیوی کی توہین وتحقیر بھی مراد لی جاسکتی ہے۔

(۳) ایسے الفاظ جن میں نہ تو تردید مراد ہو، اور نہ ہی طعن وتشنیع مراد ہو؛ بلکہ زیادہ تر وہ الفاظ طلاق کے مطالبہ کے جواب میں استعمال کئے جاتے ہوں، اگرچہ وہ طلاق کے لئے موضوع نہ ہوں، مثلاً کہا کہ: ''میں نے تجھ کو جدا کردیا'' وغیرہ۔ (اِس قسم کی مثال میں فقہاء نے ''تو آزاد ہے، تو عدت گذار لے'' جیسے الفاظ بھی لکھے ہیں، مگر اَب وہ عرف میں صرف طلاق کے لئے استعمال ہونے لگے ہیں، اس لئے ان الفاظ سے بہرحال بلانیت طلاق کے وقوع کا حکم ہوگا)

والكنايات ثلاث: ما يحتمل الرد أو ما يصلح للسبّ أو لا ولا. فنحو: أخرجي، واذهبي، وقومي، تقنعي تخمري استتري انطلقي، اغربي، أعزبي من الغربة أو من العزوبة، يحتمل ردًا، ونحو خلية، برية، حرام، بائن، ومرادفها: كبتة وبتلة يصلح سبًّا، ونحو: اعتدي، واستبرئي رحمك، أنت واحدة، أنت حرةٌ، اختاري، أمركِ بيدكِ، سرّحتكِ، فارقتكِ، لا يحتمل السب والرد. (الدر المختار ٥٢٨/٤-٥٣٢ زكريا، الفتاوىٰ الهندية ٣٧٤/١، بدائع الصنائع ١٦٨/٣ زكريا)

طلاق دینے والے کی تین حالتیں اور اُن کا حکم

مذکورہ بالا تین طرح کے الفاظ کا موازنہ طلاق دینے والے شخص کی تین حالتوں سے کیا جائے گا:

الف:- اعتدال اور بشاشت کی حالت: یعنی نہ تو آدمی غصہ میں ہو اور نہ ہی بیوی یا کسی اور شخص کی طرف سے اُس سے طلاق کا مطالبہ کیا جارہا ہو، تو ایسی صورت میں مذکورہ بالا تینوں طرح کے الفاظ میں شوہر کی نیت کا اعتبار ہوگا، اگر وہ کہے کہ میں نے طلاق کی نیت سے اِن میں سے کوئی لفظ کہا ہے تو طلاق واقع ہوگی، اور اگر قسم کھا کر یہ کہے کہ میری مراد طلاق دینے کی نہیں تھی، تو اُس کی بات مانی جائے گی اور طلاق واقع نہ ہوگی۔

ففي حالة الرضا أي غير الغضب والمذاكرة تتوقف الأقسام الثلاثة تاثيرًا على نيةٍ للإحتمال، والقول له بيمينه في عدم النية، ويكفي تحليفها في منزله. (الدر المختار ٥٣٢/٤-٥٣٣ زكريا)

ب:- غیظ وغضب کی حالت: اگر مذکورہ الفاظ ادا کرتے وقت شوہر غصہ میں ہو، تو تیسری قسم کے الفاظ (جیسے: میں نے تجھ کو جدا کردیا، عدت گذار لے وغیرہ) میں بلانیت طلاق کے وقوع کا حکم ہوگا، اور پہلی اور دوسری قسم کے الفاظ میں شوہر کی نیت پر حکم کا مدار ہوگا، اگر وہ طلاق کی نیت کا اقرار کرے تو طلاق واقع ہوگی ورنہ نہیں۔

وفي الغضب توقف الأولان إن نوىٰ وقع وإلا لا. (الدر المختار ٥٣٣/٤ زكريا)

ج:- مذاکرۂ طلاق کی حالت: اور اگر شوہر نے طلاق کے مذاکرہ کے دوران (یعنی وہ پہلے سے طلاق کی دھمکی دے رہا ہو، یا بیوی اُس سے طلاق کا مطالبہ کررہی ہو، یا مجلس میں موجود کوئی دوسرا شخص اُس کو طلاق دینے پر اِصرار کررہا ہو) کنایہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں تو دوسری اور تیسری قسم کے الفاظ میں بلانیت طلاق واقع ہوجائے گی؛ البتہ پہلی قسم کے الفاظ میں شوہر کی نیت معلوم کی جائے گی، اگر وہ طلاق کی نیت کا اقرار کرے تو طلاق واقع ہوگی، اور اگر انکار کرے تو طلاق واقع نہ ہوگی۔

وفي مذاكرة الطلاق يتوقف الأول فقط ويقع بأخيرين وإن لم ينو. (الدر المختار ٥٣٣ زكريا)

ایک نقشہ کے ذریعہ وضاحت

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اِن سب صورتوں کو درج ذیل نقشہ کے ذریعہ واضح فرمایا ہے:

طلاق دینے والے کی حالتیں:	وہ الفاظ جو طلاق کے جواب اور تردید کا احتمال رکھیں: جیسے: أخرجي (نکل جا)، إذهبي (چلی جا)	وہ الفاظ جو جواب اور طعن وتشنیع کا احتمال رکھیں: جیسے: خلية (تو خالی ہے)، برية (تو الگ تھلگ ہے)	وہ الفاظ جو صرف جواب پر مشتمل ہوں: جیسے: اعتدي (تو عدت کرلے)، استبرئي (اپنے رحم کو صاف کرلے)
حالتِ اعتدال	نیت لازم	نیت لازم	نیت لازم
حالتِ غیظ وغضب	نیت لازم	نیت لازم	بغیر نیت طلاق واقع
حالتِ مذاکرۂ طلاق	نیت لازم	بغیر نیت طلاق واقع	بغیر نیت طلاق واقع

(شامی ۵۳۴/۴ زکریا)

تنبیہ: - واضح ہو کہ جو الفاظ کنایہ میں شمار کئے گئے ہیں، اگر کوئی قرینہ اُن کے ساتھ ایسا ملحق ہوجائے جس سے اِس بات کی وضاحت ہوجاتی ہو کہ اُس سے طلاق مراد ہے یا نہیں؟ تو پھر وہ الفاظ کنایہ میں شامل نہیں رہتے؛ بلکہ صریح کے درجہ میں آجاتے ہیں، مثلاً بیوی سے یہ کہا کہ: ''تو میرے نکاح سے آزاد ہے'' تو بلانیت بھی طلاق واقع ہوجائے گی۔ اِس کے برخلاف اگر یہ کہا کہ: ''تو میری طرف سے گھر میں ہر طرح تصرف کرنے میں آزاد ہے'' تو اِس سے نیت کے باوجود بھی طلاق واقع نہ ہوگی۔ (مستفاد: مسائل بہشتی زیور ۵۱۹)

نیز بعض کنائی الفاظ اگر معاشرہ میں طلاق ہی کے لئے عموماً استعمال ہونے لگیں، تو وہ بھی صریح الفاظِ طلاق کے درجہ میں آجاتے ہیں، مثلاً بیوی سے یہ کہنا کہ: ''تو مجھ پر حرام ہے، یا تو آزاد ہے''، یہ عرفاً طلاق ہی کے لئے مستعمل ہے، تو اِن الفاظ سے بلانیت طلاق کے وقوع کا حکم ہوگا۔ اسی طرح بعض علاقوں مثلاً بہار وغیرہ میں بیوی کو جواب دینے کا لفظ طلاق کے لئے عام مستعمل ہے، وہاں بھی لفظ جواب سے بلانیت طلاق کے وقوع کا حکم ہوگا۔

وإن الحرام في الأصل كناية يقع بها البائن؛ لأنه لما غلب استعماله في الطلاق لم يبق كناية، ولذا لم يتوقف على النية أو دلالة الحال. (شامي ٥٢٩/٤ زكريا)

درج بالا اُصولی گفتگو کے بعد چند ضروری جزئیات کو ذیل میں درج کیا جارہا ہے:

بیوی سے کہا: ''عدت کرلے''

عام طور پر کنایہ کے الفاظ سے طلاقِ بائن واقع ہوتی ہے؛ لیکن اگر ایسا لفظ بولا جس سے دلالۃً

طلاق مراد لینا متعین ہو یا وہ طلاق کے لوازم میں سے ہو، مثلاً کہا کہ: ''تو عدت گذار لے'' تو اِس سے طلاقِ رجعی واقع ہوتی ہے (اس لئے کہ یہاں طلاق دینے کا لفظ محذوف ہے، گویا کہ اُس نے یہ کہا ہے کہ: ''میں طلاق دے چکا، اَب تو عدت گذار لے''، پس اس ضمنی صراحت کی وجہ سے طلاقِ رجعی ہوگی)

تطلق واحدة رجعية في اعتدي. (الفتاوىٰ الهندية ۳۷۵/۱)

وتقع رجعية بقوله اعتدي واستبرئي رحمک وأنت واحدة (درمختار) لأنه من باب الأضمار أي طلقتک فاعتدي أو اعتدي لأني أطلقک. (شامي ٥٣٤/٤ زكريا)

کہا: ''دوسرا شوہر تلاش کر لے''

اگر کسی شخص نے طلاق دینے کی نیت سے اپنی بیوی سے کہا کہ: ''تو دوسرا شوہر تلاش کر لے''، تو اُس کی بیوی پر ایک طلاقِ بائن واقع ہو جائے گی، حتیٰ کہ اگر اس لفظ سے دو یا تین طلاق کی نیت کی ہو تو بیوی پر دو یا تین طلاق واقع ہوں گی۔

وبابتغي الأزواج تقع واحدة بائنة إن نواها أو اثنتين أو ثلاث إن نواها، كذا في شرح الوقاية. (هندية ۳۷۵/۱)

کہا: ''میں تیرا شوہر نہیں ہوں''

اگر شوہر طلاق کی نیت سے اپنی بیوی سے کہے کہ: ''میں تیرا شوہر نہیں ہوں''، تو بیوی پر ایک طلاق واقع ہو جائے گی، ہاں اگر شوہر یہ دعویٰ کرے کہ میں نے جھوٹ بولا ہے تو پھر اس کی تصدیق کی جائے گی اور طلاق واقع نہیں ہوگی۔

أو قال لها ما أنا بزوجک ..... فإن قال: أردت به الكذب يصدق في الرضا والغضب جميعاً ولا يقع الطلاق، وإن قال: نويت الطلاق يقع الطلاق في قول أبي حنيفة. (الفتاوىٰ الهندية ۳۷۵/۱)

بیوی نے کہا: ''تو میرا شوہر نہیں ہے''

اگر بیوی نے شوہر سے کہا کہ: ''تو میرا شوہر نہیں ہے'' اور شوہر بھی طلاق کی نیت سے اُس کی تصدیق کر دے، تو دونوں کے درمیان نکاح ختم ہو جائے گا۔

ولو قالت المرأة لزوجها لست لي بزوجٍ، فقال الزوج: صدقت ونوى به الطلاق،

يقع في قول أبي حنيفة رحمه اللّٰه تعالىٰ، كذا في فتاوىٰ قاضي خان. (الفتاوىٰ الهندية ۳۷۵/۱)

کہا: ''میں اس کو اپنی بیوی نہیں سمجھتا''

بیوی کے بارے میں کہا کہ: ''میں اس کو اپنی بیوی نہیں سمجھتا'' تو اگر طلاق کی نیت یا اس کا قرینہ پایا جائے تو طلاق واقع ہوجائے گی۔

لست لک بزوج أو لست لي بامرأة أو قالت له: لست لي بزوج، فقال: صدقت، طلاق إن نواه. (شامي ۶۳۲/۲، مستفاد: فتاوىٰ دار العلوم ديوبند ۴۶۱/۹)

کہا: ''تو میری بیوی نہیں ہے''

اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے طلاق کی نیت سے یہ کہے کہ: ''تو میری بیوی نہیں ہے'' تو ایک طلاق واقع ہوجائے گی؛ لیکن اگر شوہر یہ کہے کہ میں تو جھوٹ موٹ کہہ رہا تھا، میرا مقصد طلاق دینے کا نہ تھا تو بیوی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی۔

ولو قال لامرأته لست لي بامرأة، فإن قال أردت به الكذب يصدق في الرضا والغضب جميعاً ولا يقع الطلاق. (الدر المختار مع الشامي ۶۲۳/۲، فتاوىٰ دار العلوم ديوبند ۳۸۹/۹)

وإن قال: نويت الطلاق يقع الطلاق في قول أبي حنيفة. (الفتاوىٰ الهندية ۳۷۵/۱)

کہا: ''میں نے نکاح ختم کردیا''

اگر کسی شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ ''میں نے تجھ سے اپنا نکاح ختم کردیا'' تو طلاق واقع ہوجائے گی، اب اگر اس نے ایک طلاق کی نیت کی ہے، تو اس کی بیوی پر ایک طلاق واقع ہوگی، اور اگر تین طلاق کی نیت سے کہا تو پھر تینوں طلاق واقع ہوجائیں گی۔

ولو قال: فسخت النكاح ونوى الطلاق يقع، وعن أبي حنيفةؒ إن نوى ثلاثاً فثلاث، كذا في معراج الدراية. (الفتاوىٰ الهندية ۳۷۵/۱)

کہا: ''تیرے میرے درمیان نکاح باقی نہیں ہے''

اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے کہ ''تیرے اور میرے درمیان نکاح باقی نہیں رہا ختم ہوگیا''، تو اگر اس نے طلاق کی نیت کرلی اس کی بیوی پر ایک طلاق واقع ہوجائے گی۔

ولو قال لها لا نكاح بيني وبينك أو قال: لم يبق بيني وبينك نكاح يقع الطلاق إذا نوى. (الفتاوىٰ الهندية ۳۷۵/۱)

کہا: ''اپنی زوجیت سے علیحدہ کرتا ہوں''

بیوی سے کہا کہ ''میں تجھے اپنی زوجیت سے علیحدہ کرتا ہوں'' تو اس لفظ سے ایک طلاق بلانیت واقع ہوجائے گی۔

ويقع بابرأتك عن الزوجية بلا نية (درمختار) قوله بلا نية: في حال الغضب وغيره. (تاتارخانية) ومقتضاه أنه طلاق صريح وفيه نظر وفي كنايات الجوهري أنا بريءٌ من نكاحك يقع إن نوى. (الدر المختار مع الشامي ٦١٤/٢، مستفاد: فتاوىٰ دار العلوم ديوبند ۳۸۸/۹)

بیوی سے کہا: ''جا، شادی کرلے''

طلاق کی نیت سے بیوی سے کہا کہ: ''جا، شادی کرلے'' تو ایک طلاق بائن واقع ہوجائے گی۔

ولو قال لها إذهبي فتزوجي تقع واحدة، إذا نوى، فإن نوى الثلاث تقع الثلاث. (الفتاوىٰ الهندية ۳۷٦/۱)

بیوی سے کہا کہ: ''میں تجھے نہیں چاہتا ہوں''

اگر کسی شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ: ''مجھے تم سے محبت نہیں ہے اور میں تمہیں نہیں چاہتا'' تو اِس کہنے سے بیوی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، اگرچہ شوہر نے طلاق کی نیت کی ہو۔

إذا قال: لا أريدك أو لا أحبك أو لا أشتهيك أو لا رغبة لي فيك فإنه لا يقع، وإن نوى في قول أبي حنيفةؒ، كذا في البحر الرائق. (الفتاوىٰ الهندية ۳۷۵/۱)

کہا: ''مجھ سے دور ہوجا''

طلاق کی نیت سے بیوی سے کہا کہ: ''مجھ سے دور ہوجا'' تو اس سے ایک طلاقِ بائن واقع ہوجائے گی، اور اگر طلاق کی نیت نہ ہو تو کوئی طلاق واقع نہ ہوگی۔

ولو قال أبعدي عني ونوى الطلاق يقع، كذا في فتاوىٰ قاضي خان. (الفتاوىٰ الهندية ۳۷٦/۱)

کہا: ''اپنی سہیلیوں کے پاس چلی جا''

اگر کسی شخص نے بیوی سے کہا کہ: ''تو اپنی سہیلیوں کے پاس جا کر رہ''، اور اُس کا مقصد طلاق دینا ہو، تو بیوی پر ایک طلاقِ بائن واقع ہو جائے گی۔

وفي الحقي برفقتک يقع إذا نوى، كذا في البحر الرائق. (الفتاوىٰ الهندية ٣٧٥/١)

کہا: ''میرے یہاں سے نکل جا''

بیوی سے کہا کہ: ''میرے یہاں سے نکل جا'' تو اگر طلاق کی نیت کی یا مذاکرۂ طلاق میں یہ جملہ بولا تو طلاق پڑے گی ورنہ نہیں۔

قال في الدر المختار: فنحو اخرجي واذهبي وقومي، يحتمل رداً ..... **وفي الغضب توقف الأولان** ..... **أي ما يصلح رداً وجواباً.** (الدر المختار مع الشامي ٦٣٧/٢، مستفاد: فتاوىٰ دار العلوم ديوبند ٣٩٣/٩)

''تجھ کو نہیں رکھوں گا، تجھ کو چھوڑ دیا''

''تجھ کو نہیں رکھوں گا''، یہ مستقبل کا صیغہ ہے، اس سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی؛ لیکن ''تجھ کو چھوڑ دیا'' کہنے سے ایک طلاق واقع ہو جائے گی۔

ثم فرق بينه وبين سرحتک فإن سرحتک كناية، فإذا قال: ''رہا کردم'' أي سرحتک، يقع به الرجعي، مع أن أصله كناية أيضاً. (شامي ٢٩٩/٣ كراچی، الفتاوىٰ الهندية ٣٧٩/١، خلاصة الفتاوىٰ ٢٩٩/٢) **بخلاف ''کنم'' لأنه استقبال فلم يكن تحقيقاً بالتشكيک.** (الفتاوىٰ الهندية ٣٨٤/١، مستفاد: فتاوىٰ دار العلوم ديوبند ٤٧٦/٩)

بیوی سے کہا: ''کبھی میرے پاس نہ آنا''

''کبھی میرے پاس نہ آنا'' کہنے سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ۴۲۷/۹)

کہا: ''اللہ نے تیری طلاق کا فیصلہ کر دیا''

بیوی سے کہا کہ: ''اللہ نے تیری طلاق کا فیصلہ کر دیا'' تو اس سے بلا نیت کوئی طلاق واقع نہ ہوگی؛ البتہ اگر طلاق کی نیت سے یہ جملہ ادا کرے گا تو طلاق واقع ہو جائے گی۔

رجل قال لامرأته ..... **قضى الله طلاقک لم يكن طلاقاً إلا أن ينوي.** (هندية ٣٥٩/١) ❐